ادراک
کتاب ششم
پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger
مرتبین
ڈاکٹر سید حسن عباس
پروفیسر محمد ناظر صدیقی
پروفیسر حافظ شبیر احمد حیدری
ڈاکٹر آفتاب اشرف
ڈاکٹر محمد سلمان

مشورت ادراک و ہشیاری دہد — عقلہا را عقلہا یاری دہد (مولانا روم)

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے (اقبال)

(کتاب ششم)

مرتبین

- ڈاکٹر سید حسن عباس
- پروفیسر محمد ناظر صدیقی
- پروفیسر حافظ شبیر احمد حیدری
- ڈاکٹر آفتاب اشرف
- ڈاکٹر محمد سلمان

ناشر

مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، باقر گنج، سیوان۔ بہار (ہند)

نام کتاب : ادراک (کتاب ششم)

سال اشاعت : ۲۰۰۷ء

تعداد اشاعت : ۵۰۰

کمپوزنگ : کمپوز گرافکس، برلا مندر روڈ، پٹنہ-۶

مطبع :

قیمت : ۱۵۰ روپے

IDRAK

KITAB-E-SHASHUM

Compiled by a Board

Year of Pub. : 2007 Price : Rs.150/-

Publisher

Markaz-e-Tahqiqat Urdu-o-Farsi

Gopalpur, Baqarganj, Siwan

Bihar (India)

مجلس مشاورت

معاونین

- محمود الحسن
- فہیم جوگاپوری
- امانت حسین
- ارشاد احمد
- فاروق سیوانی
- چمن شرما شرر سیوانی
- ڈاکٹر منظر امام

فہرست

پیش نامہ

ادراک کتاب ششم، آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے نہایت خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ حال آں کہ سچائی یہ ہے کہ کسی قسم کا فیڈ بیک نہ ہونے کے سبب اس کی طباعت خاصی تاخیر سے عمل میں آتی ہے۔ اردو کے علمی ادبی جرائد کا المیہ تو یہی ہے کہ ان کے وسایل بے حد محدود ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو مواد کی کمی ہے اور نہ ہی عزم وحوصلے کی۔ کمی ہے تو بس کسی 'دستِ غیب' کی۔

اس کتاب ششم میں بھی 'مکتوبات' خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ یہ خطوط اردو کی سر برآوردہ شخصیات کے ہیں جن میں بہت سی علمی باتوں کے ساتھ مذکورہ شخصیات کے ذاتی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ 'ادراک' میں مکتوبات کی اشاعت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے تاکہ ایسے مکتوبات جو علمی وادبی پس منظر میں لکھے گئے ہیں، اہل علم کی خدمت میں پیش کیے جاتے رہیں۔ اس بار جو خطوط شامل اشاعت ہیں اُن میں مالک رام صاحب، پروفیسر نظیر صدیقی اور مشفق خواجہ صاحب کے کچھ خطوط کا آپ مطالعہ فرمائیں۔ تینوں شخصیات ہمارے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں نمایاں مقام ومرتبے کی حامل ہیں جن سے اربابِ علم وادب بخوبی واقف بھی ہیں۔ مالک رام صاحب کا نام ہماری تحقیق کا ایک اہم نام ہے۔ اسی طرح پروفیسر حنیف نقوی صاحب کے علمی اور تحقیقی کاموں کی نوعیت، کیفیت اور اہمیت سے بھی اہل علم آگاہ ہیں۔ نقوی صاحب کا نام تحقیق کا ایک معتبر نام ہے۔ نظیر صدیقی مرحوم کے خطوط اس سے قبل بھی ہم نے شایع کیے تھے جسے پاکستان میں بغیر حوالے کے 'ری پرنٹ' کیا گیا۔ مشفق خواجہ مرحوم اور اردو لازم وملزوم ہیں۔ وہ ہمارے ادب کا ایک نہایت معتبر اور محترم نام ہے۔ ان کی شخصیت اور خدمات کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم ان پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کرتے لیکن اپنی تنگ دامانی بھی دیکھتے ہیں، لہٰذا صرف ایک 'گوشہ' ترتیب دے کر اُن کی عظیم اور قابل تقلید شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک 'گوشہ' نکالا گیا ہے۔

'مقالات' کے باب میں حسب سابق چند مفید مقالے شامل اشاعت ہیں۔ 'دریافت' کے تحت، میر تقی میر کی فارسی مثنوی 'دریائے عشق' کا متن جو ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کی خاموش کوشش کا نتیجہ ہے، مختصر مقدمے کے ساتھ اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کیا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ متن ایک ہی قلمی نسخے کی اساس پر تیار ہوا ہے اس لیے احتمال ہے کہ کہیں کوئی نقص رہ گیا ہو، اگر اہل علم کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ موصول ہوا یا اس کے کسی اور نسخے کا پتا چلا تو ان شاء اللہ بعد میں اسے اور صحیح طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی

جائے گی۔ ڈاکٹر ظفر کمالی نے غالب کا ایک قطعۂ تاریخ تلاش کیا ہے جسے 'بازیافت' کے تحت ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔

'کتبات' کے تحت حسین آباد (چپلا) میں سیرالمتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی کے خاندانی قبرستان میں موجود ان کے اہل خاندان کی قبروں کے کتبے پیش کیے جارہے ہیں۔ ایک کتبہ جناب رضا قاسم مختار نے بہت پہلے ماہنامہ 'ندیم' گیا میں شائع کیا تھا جو اغلاط کتابت کے سبب مخدوش ہوگیا تھا۔ میں نے ایک سفر کے دوران خود کتبوں کی نقل اور تصویریں اُتاری تھیں، انھیں حتی الامکان صحیح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'قند پارسی' کے تحت انھیں مطالعہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر رئیس نعمانی، اردو اور فارسی کے پُرگو اور خوش فکر شاعر ہیں، ان کے دو قطعات تاریخ اسی ذیل میں شامل اشاعت ہیں۔ 'چھیڑ خوباں' کے تحت اس بار عبید زاکانی کے چند لطائف سے آپ کی ضیافت طبع کا انتظام کیا گیا ہے۔ 'بیاتے' میں چند کتابوں پر حسب سابق تبصرے شامل اشاعت ہیں۔

'ادراک' کی مجلس مشاورت اور ادارے کے ایک اہم مخلص رکن پروفیسر نادم بلخی نے ڈالٹن گنج میں ۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ نادم بلخی ایک بلند قامت اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ایک استاد، شاعر، ادیب و سوانح نگار کی حیثیت سے اردو ادب کے سرمایے میں اضافہ کیا اور کئی نسلوں کی تربیت کی۔ پلاموں جیسے دور افتادہ مقام پر اردو شعر و ادب کی شمع کو روشن رکھنا اُن ہی جیسی نابغۂ روزگار شخصیات سے ممکن بھی تھا۔ اب ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا محال ہے۔ گزشتہ سال ادارے نے اُن کی شخصیت اور ادبی خدمات پر ایک دستاویزی کتاب 'ذکر نادم بلخی' شائع کی تھی جس کی اہل علم نے خاطر خواہ پذیرائی کی۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کتاب اُن کی حیات مستعار میں ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آگئی اور انھوں نے اسے بہ چشم خود ملاحظہ بھی فرمالیا تھا۔

ہم پروفیسر نادم بلخی کے سانحۂ ارتحال پر ان کے پس ماندگان اور متعلقین کے غم میں شریک ہیں اور مرحوم کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

سید حسن عباس

❁

مالک رام بنام حنیف نقوی

(۱)

12/5 WEA, Karol Bagh
New Delhi
۱۹۵۸/۱/۲۹ء

حضرت المکرّم، آداب وتسلیمات

۲۵/۱ کے گرامی نامہ کا شکریہ۔ میری کتاب 'تلامذۂ غالب'[1] ہفتے عشرے میں شائع ہو رہی ہے۔ اس میں ان تینوں حضرات[2] کا ترجمہ موجود ہے۔ افسوس کہ میری موجودہ مصروفیات ایسی ہیں کہ اگر میں نے انھیں نقل کرنے کے لیے فرصت کا انتظار کیا تو اس میں تاخیر ناگزیر ہوگی۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

---

[1] تلامذۂ غالبؔ کا پہلا ایڈیشن مرکز تصنیف وتالیف، نکودر (ضلع جالندھر، پنجاب) نے شائع کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں کسی جگہ اس کا سال اشاعت درج نہیں۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

[2] تینوں حضرات سے غالبؔ کے تین سہسوانی شاگرد حکیم سید احمد حسین قدؔا، جناقؔ، میر عالم علی خاں مآلؔ اور میر ابراہیم علی خاں وفاؔ مراد ہیں۔

---

(۲)

431, Mathura Road, Jangpura B
New Delhi-14
۲۸/اگست ۱۹۶۴ء

بندہ نواز

۲۵/اگست کے گرامی نامہ کا شکریہ۔

میں انشاءاللہ کل تو نہیں، اب پیر کو کتاب[1] آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ امید ہے اتنی سی تاخیر کا خیال نہ فرمائیں گے۔

عام حالات میں کوئی دو ہفتے میں آپ کا کام پورا ہو جانا چاہیے۔ انشاءاللہ۔

آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی تھی[2]۔ خدا آپ کے تمام نیک عزائم میں آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

[1] کتاب سے تذکرۂ بے جگر کے نسخۂ لندن کا عکس مراد ہے جو مجھے اپنے پی ایچ ڈی کے کام کے سلسلے میں درکار تھا۔

[2] میں نے اگست ۱۹۶۳ء کے دوسرے ہفتے میں کسی دن اپنے ماموں پروفیسر سید عبدالخالق نقوی صاحب مرحوم کے ساتھ مالک رام صاحب کی خدمت میں پہلی بار حاضری کا شرف حاصل کیا تھا۔

۱۲ر نومبر ۱۹۶۳ء (۳)

مکرم بندہ آداب

۱۰ر نومبر کے گرامی نامے کا شکریہ۔

تذکرہ[1] مل گیا تھا اور آپ کے شاید دو خط بھی ملے، جواب نہ دے سکا اور شرمسار ہوں۔ میری مصروفیتیں جو ہیں، اب ان سے تو مفر نہیں؟ لیکن اس طرف میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا جس سے داہنی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اتنے دن تک کہنی سے لے کر نصف پنجے تک پلاسٹر میں رہا، یہی کوتاہ قلمی کا باعث ہوا۔ الحمد للہ پلاسٹر کھل گیا ہے اور ہڈی جڑ گئی ہے۔ ابھی تک لکھنے میں البتہ تکلیف ہوتی ہے۔

آپ مہربانی فرما کر اپنے سوالات پھر لکھیے[2]۔ تلاش سے خط مل تو جائیں گے لیکن اس میں وقت ضائع ہوگا اور آپ کے لکھنے سے یک جا معلوم ہو جائے گا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔

میں جے پور نہیں جا سکا تھا[3]۔ واقعہ یہ ہے کہ منصبی کام میرے ذمے اس نوعیت کے ہیں کہ چھٹی لینے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں کہ واپسی پر کام کی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ پھر پندرہ دن کا وہ بقایا پورا کرنے کے لئے دفتر میں دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

[1] تذکرہ بے جگر کا عکس مراد ہے جس کا ذکر ۲۸ر اگست کے خط میں آچکا ہے۔

[2] یہ سوالات بعض تذکروں اور ان کے قلمی نسخوں سے متعلق تھے۔

[3] ۲-۳ر اکتوبر ۱۹۶۳ء، آل انڈیا اردو کانفرنس جے پور کا واقعہ ہے۔ اس سے کچھ دن پہلے غالباً اکتوبر میں جے پور میں کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس ہوئی تھی، اس کی جانب اشارہ ہے۔

۳۱/جنوری ۱۹۶۵ء

صاحب میں آپ کا قصوروار ہوں۔ آپ کے کتنے خطوں کا جواب میرے ذمے ہے اور آج کل کرنے میں مہینوں گزر گئے ہیں، معافی چاہتا ہوں۔ اسی دوران میں آپ کا پہلا خط بھی کاغذوں میں سے دستیاب ہو گیا، دونوں کا جواب ملاحظہ ہو۔

واقعی تذکرے کا متن پڑھنے میں بہت دقت ہوئی۔ خود مجھے بعض مقامات سے متعلق اطمینان نہیں۔ لیکن ایک بات کا یقین ہے کہ ان الفاظ کے واضح نہ ہونے سے کسی شاعر سے متعلق کوئی اہم معلومات ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہیں زیادہ عبارت آرائی ہے، اور اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ (۱) میں سال رواں میں اسے شائع کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں انشاء اللہ۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم۔ (۲) شرف الدین مسرور کا تذکرہ[۱] میری نظر سے گزرا اور مجھے یہ بھی علم نہیں کہ اس کا کوئی نسخہ کسی جگہ محفوظ ہے یا نہیں۔

(۳) میرے خیال میں یہ بے جگر کا اپنا نسخہ ہے' اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس پر نظر ثانی بعض اور اصحاب نے کی ہے۔ اس پر کم از کم دو اور اصحاب کی تحریریں ہیں۔

(۴) 'عمدۂ منتخبہ'[۲] کے لندن اور پیرس کے نسخوں کے عکس میرے پاس ہیں۔ میں نے آپ کا مضمون دیکھا تھا۔ اچھا ہے لیکن آپ نے مطبوعہ نسخے کا اس طرح تبصرہ نہیں کیا جس کا وہ مستحق ہے[۳]۔

(۵) 'معیار الشعراء' کا کوئی اور نسخہ میرے علم میں نہیں۔

میری صحت اب بفضلہ تعالیٰ بہتر ہے۔ عمر کے تقاضے سے کچھ چڑک دھانس تو رہتی ہی ہے اس کی شکایت کیا!

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل شامل حال رکھے' آپ کا مقالہ تو اب ختم ہونے والا ہوگا۔ میں تاخیرِ جواب کے لئے پھر معافی خواہ ہوں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱۔ شرف الدین مسرور مشہور تذکرے 'طبقات سخن' کے مولف مولوی غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی کے معاصر ہوتے تھے۔ ان کا یہ تذکرہ جس کا ایک نسخہ لالہ سری رام کے کتب خانے میں موجود تھا، اب نایاب ہے۔ یہ [illegible] میں لکھا گیا تھا اور ۱۸۲۱ء سے قبل مرتب ہو چکا تھا۔

۲۔ یہ تذکرہ مارچ ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ 'عمدۂ منتخبہ' سے متعلق میرا یہ مضمون سہ ماہی 'اردو ادب' علی گڑھ سے ۱۹۶۳ء کے شمارہ نمبر ۲ میں شائع ہوا تھا۔

۱ میر، شعرا کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے کتب خانے میں موجود ہے جو خود مولف تذکرہ خوب چند ذکا کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ [illegible] کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مالک رام صاحب کو اس دوسرے نسخے کا علم نہ تھا۔

Sahitya Akademi
National Academy & Letters
Rabindra Bhawan, New Delhi
Telegram Sahityakar,
Phone-43581

President S Radhakrishnan
Vice President Zakir Husain

(۵)

۱۸ اپریل ۱۹۶۶ء

مکرم بندہ، آداب

نادم ہوں کہ اپنی کوتاہی اور مصروفیتوں کے باعث آپ کے ۳ فروری کے گرامی نامہ کا شکریہ اتنی تاخیر سے ادا کر رہا ہوں جس کے ساتھ آپ نے مولانا آزاد مرحوم کے ایک خط[۱] کی نقل روانہ کی تھی۔

آپ نے لکھا ہے کہ نقل کی بجائے اصل پیش کرتے ور میں کہتا ہوں کہ آپ اصل ہی کیوں نہ دیں۔ آخر ایک خط آپ کے پاس رہا تو کس کے پاس رہا؟ یہ یقیناً ضائع ہو جائے گا۔ اور یہاں[۲] مرحوم کی تمام چیزیں محفوظ کی جا رہی ہیں۔ مشاہیر کی چیزیں اسی طرح ضائع ہو جاتی ہیں۔ لوگ جذباتی لگاؤ کے باعث انھیں الگ نہیں کرتے اور وہ مرور زمانہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کا کتاب خانہ کتنا قیمتی تھا لیکن اس کا پتہ تک نہیں۔ والسلام

خاکسار

مالک رام

---

۱ یہ خط [illegible] ۲۵ جنوری ۱۹۳۳ء [illegible] لکھا گیا تھا۔ [illegible] (شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۷) میں شامل ہے۔

۲ یہاں سے مراد ساہتیہ اکادمی ہے۔ مالک رام صاحب اس زمانے میں ساہتیہ اکادمی کے ایک پروجیکٹ کے تحت مولانا آزاد کی تصانیف کی تدوین و ترتیب میں مصروف تھے۔

C-504, Defence Colony
New Delhi–24

(۶)

۲۳ اپریل ۱۹۶۸ء

مکرمی، آداب

شکریہ آپ کا ۱۹ اپریل کا گرامی نامہ ملا۔ اس سے ایک دن پہلے مکتبہ جامعہ نے آپ کا مرسلہ تحفہ[۱] میرے پاس بھیج دیا تھا۔ دونوں کا شکریہ!

کرم ہو، اگر ان امور کی طرف توجہ کے لیے وقت نکال سکیں۔ ڈاکٹر نیر صاحب سلام قبول فرمائیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

۱ مالک رام صاحب کا یہ خط مجھے نہیں ملا۔

۲ غالباً حکیم آغا جان عیش کے کلیات کے قلمی نسخے کا عکس مراد ہے۔

۳ عزیز سے دیوان علی خاں ولایت وزیر منشی پوری شاگرد غالب مراد ہیں۔

۴ خورشید جان، طوائف، تخلص بہ حسین، متوطن دہلی، مقیم کلکتہ۔ 'تلامذۂ غالب' کے پہلے ایڈیشن میں انھیں بہ حیثیت مرد خورشید صاحب دہلوی کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔

C-504, Defence Colony,

(۸)

New Delhi—110024

۳۱ راگست ۱۹۸۲ء

Urgent

کرم فرمائے من ڈاکٹر نقوی صاحب، آداب

آپ کے وہاں لائبریری کے سرکاری ذخیرہ میں حکیم آغا جان عیش[۱] کے دیوان کے دو قلمی نسخے ہیں[۲]۔ مجھے ان کے عکس کی فوری ضرورت ہے۔ نیر صاحب نے وعدہ کیا تھا۔ اس پر مہینوں گزر گئے۔ یاد دہانی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ براہ کرم ان کے عکس لے کر فوراً بھجوانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ ممنون احسان ہوں گا۔ اگر تخمینہ معلوم کر کے عکس پر کیا لاگت آئے گی تو میں مطلوبہ رقم پیشگی بھیج دوں۔ کام بہر حال عجلت کا ہے۔

ڈاکٹر نیر صاحب کو بھی مطلع کر دیجیے کہ ہم آپ مجبور رہے ہیں تاکہ کسی وقت انھیں یاد آجائے تو وہ بھی نہ بھجوا دیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

۱ غالب کے مشہور معاصر (متوفی ۲۹ رجون ۱۸۷۳ء)

۲ ہمارے یہاں [illegible] مخطوطات میں عیش کے کلام کا صرف ایک نسخہ بنام 'کلیات عیش' موجود ہے جو ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء کا مکتوبہ ہے۔

(۹)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۲۱ر ستمبر ۱۹۸۲ء

مکرمی

گرامی نامہ کا شکریہ !

دو باتیں! وہاں میرے علم میں حکیم آغا جان عیش کے دیوان کے دو قلمی نسخے ہیں۔[1]

دوسرے، مائکروفلم نہیں، فوٹوسٹاٹ یا زیراکس درکار ہے۔ کہیں مائکروفلم نہ بھیج دیجیے گا۔ اسے پڑھنے کا سامان کہاں سے لائیں گے !

خدا کرے آپ کی توجہ سے یہ کام جلد ہو جائے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

[1] یہ اطلاع صحیح نہیں۔ جیسا کہ مکتوب نمبر ۸ کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ذخیرۂ مخطوطات میں عیش کے کلام کا صرف ایک نسخہ محفوظ ہے۔

---

(۱۰)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۲ء

کرم فرمائے من ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب، آداب

اتر پردیش اردو اکادمی کا دو ماہی 'اکادمی' میرے پاس آتا ہے لیکن اور اور معروفیتوں کے باعث میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا، اور سال بھر کے شمارے جمع ہو گئے۔ بہر حال ادھر میں نے انھیں دیکھا، تو اس کے شمارہ ۲ میں آپ کا مضمون عزیز صفی پوری نظر سے گزرا۔ یہی اس خط کے لکھنے کا باعث ہوا۔ آپ نے مضمون بہت تفصیل سے مبسوط لکھا ہے۔ اللّٰھم زد فزد

میں نے کتابوں کی تفصیل دانستہ نہیں لکھی تھی، اگرچہ ان میں سے بیشتر میرے علم میں تھیں۔ بہر حال اگر آپ چاہتے ہیں تو دوسرے ایڈیشن[2] میں ان کے ناموں کا اضافہ کر دوں گا۔ میں نے 'وغیرہ' لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔

خیر، اس وقت یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ کیا آپ کی نظر سے عزیز کی تصویر کہیں گذری ہے؟ چونکہ

طبع ثانی کی کتابت ہو رہی ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ اگر تصویر مل جائے تو اسے بھی شامل کتابت کرلوں۔ وہ دیوان عیش کا عکس کب تک تیار ہو جائے گا؟ ڈاکٹر حکم چند نیر سلام قبول کریں۔

پس نوشت: ایک اور خیال آیا۔ اگر آپ کے پاس عزیز کے اردو اور فارسی کے دیوان اور سوانح اسلاف[۳] کے ہوں، تو چند دن کے لیے مستعار عنایت کیجیے۔ شکریہ پیشگی۔ والسلام

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱۔ شمارہ اگست - ستمبر ۱۹۸۱ء

۲۔ تلامذۂ غالب کا دوسرا ایڈیشن مراد ہے۔

۳۔ مرزا مصفی پوری کی خود نوشت حسن کے نسخے کمیاب ہیں۔ اس کا ایک نسخہ راقم السطور کو دستیاب ہو گیا تھا وہی ان کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھنے کا محرک ہوا تھا۔

---

(۱۱)

C-504, Defence Colony
New Delhi-110024

کرم فرمائے من، آداب

بہت شرمندہ ہوں کہ آج تک آپ کے خطوط کا جواب نہیں لکھ سکا۔ پہلے خود بیمار رہا، پھر خاندان بھر یکے بعد دیگرے اس کی لپیٹ میں آگیا، بلکہ بچے تو ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔ کچھ دنیوی مکروہات بھی دامنگیر رہیں۔ غرض ایک کے بعد دوسری چیزیں مانع رہیں۔ معافی کا خواستگار ہوں!

۱۔ دیوان عیش کا عکس اور آپ کی مرسلہ کتابیں موصول ہو گئیں، شکریہ! عکس پر کیا خرچ آیا؟ معلوم ہو، تو مطلوبہ رقم بھیج دوں۔ یہ نہ بھولیے گا۔

۲۔ میں ابھی تک کتابیں نہیں دیکھ سکا۔ جلد واپس کر دوں گا۔ اردو کلام کا یہ مجموعہ تو میرے پاس ہے، اور اسی سے میں نے پہلے ایڈیشن کے لیے انتخاب لیا تھا۔ مجھے فارسی کا کلام دیکھنے کا آج تک کوئی موقع نہیں ملا۔

۳۔ تلامذہ سے متعلق جو اشارات آپ نے قلمبند کیے ہیں[۱]، انھیں بالاستیعاب دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا، ان سے استفادہ کروں گا۔ لیکن ایک بات فوراً لکھ سکتا ہوں کہ ہرگوپال تفتہ اور ہرگوپال خستہ دو الگ الگ شخص ہیں۔ خستہ کشمیری تھے، ان کے بھائی ٹانک چند بھی شعر کہتے تھے۔ مرحوم عبدالقادر سروری نے ان دونوں سے متعلق اپنے قیام سری نگر کے دوران میں ایک مقالہ بھی لکھا تھا۔

۴۔ حسین، خورشید جان اور سرور[۲] کا تمام کلام درکار ہے۔ بلکہ اگر آسانی سے 'نتیجۂ سخن'[۳] کے شمارے

چند دن کے لیے مستعار مل سکیں، تو ممنون ہوں گا۔ میں مناسب انتخاب خود کرلوں گا۔

ڈاکٹر نیر صاحب سلام قبول فرمائیں۔ فوٹو اسٹیٹ کی رقم لکھ بھیجیے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱۔ حلاف معمول اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ میرے تحریری نوٹ کے مطابق اس کا جواب یکم جنوری ۱۹۸۳ء کو لکھا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اسے دسمبر ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتے کی تحریر ہونا چاہیے۔

۲۔ مالک رام صاحب کو تین کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے دو 'سوانحِ اسلاف' اور 'عرفانِ عزیز' کے نام یاد ہیں۔ تیسری کتاب کا نام اب یاد نہیں آتا۔

۳۔ کچھ دنوں پہلے لکھنؤ میں جناب مقبول احمد لاری مرحوم کے دولت کدے پر میر اکاڈمی کے صدر تقسیم انعامات کے موقعے پر مالک رام صاحب سے نہایت تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں نے انہیں 'تلامذۂ غالب' کی بعض خامیوں کی جانب متوجہ کیا تھا۔ بعد ازاں ان کے حسبِ ارشاد اس موضوع سے متعلق ایک مفصل یادداشت قلمبند کر کے ان کی خدمت میں روانہ کردی تھی، یہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔

۴۔ چودھری عبد الغفور سرور مارہروی 'تلامذۂ غالب' کے پہلے ایڈیشن میں مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا تھا "ان کا کلام نہیں ملتا۔ حسنِ اتفاق سے ان کے چند قطعات محفوظ رہ گئے ہیں جو انھوں نے سید فرید احمد صفیر بلگرامی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی تقریب پر لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایک قصیدۂ نعتیہ ملا ہے۔" (ص ۱۵۱) راقم السطور نے مختلف مآخذ سے ان کے فارسی و اردو کے تریسٹھ (۶۳) اشعار دریافت کیے تھے۔

۵۔ 'نتیجۂ سخن' ایک ماہانہ گلدستہ تھا جو کلکتے سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۶ء تک کے متعدد شمارے بنارس ہندو یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض شماروں میں 'بی خورشید جان طوائف، دہلوی مقیم کلکتہ، متخلص بہ حسین، خوشہ چینِ حرمنِ حضرت غالب' کی طرحی غزلیں بھی شامل ہیں۔

C-504, Defence Colony,
New Delhi–110024

۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء

محبِ مکرم، آداب

آپ نے انجمن کی صدارت[۱] پر مبارکباد کا تحفہ بھیجا۔ اس کے لیے شکریہ قبول فرمایئے۔
اب دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس نئی ذمے داری سے سرخرو ہونے کی توفیق بھی ارزانی فرمائے۔ آمین!
میری صحت جیسی کچھ ہے، وہ آپ سے مخفی نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم

ڈاکٹر عزیز سلام قبول فرمائیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱؎ انجمن ترقی اردو (ہند) کی صدارت جس کی مدت کار پانچ سال ہوتی ہے۔ مالک رام صاحب اس منصب پر ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک اور دوسری بار ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۳ء تک فائز رہے۔

---

(۱۳)

C-504, Defence Colony
New Delhi–24

۲۳ر اپریل ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر صاحب، آداب

بہت دن ہوئے، آپ نے کسی خط میں سرور تبریزی کے بارے میں کچھ لکھا تھا۱؎۔ آپ کا وہ خط کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے، اور فوری طور پر دستیاب نہیں ہو رہا۔

اب جو تلامذہ غالب کی نظر ثانی میں ردیف 'س' تک پہنچا تو خیال آیا۔ لکھیے کہ آپ کیا چاہتے تھے۔ سرور تبریزی غالب کے شاگرد تو ہیں نہیں۔ آپ نے مزید فرمایا تھا کہ آپ کو چودھری عبد الغفور سرور کے ۲۳ر اشعار مختلف مآخذ سے ملے ہیں یہ سب نقل کروا کے عنایت کر دیجیے تا کہ ایک جگہ محفوظ ہو جائیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ کتابت کا کام (اگر چہ رک رک کر) خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے۔ کتاب شاید سال کے آخر تک طبع ہو۔ لیکن اب کے ضخامت تقریباً ڈیوڑھی ہو جانے کا 'اندیشہ' ہے۔ اسی لحاظ سے قیمت بھی بڑھ جائے گی۔ اسے خریدے گا کون! میری صحت کچھ بہت ٹھیک نہیں۔ اتنی بھی غنیمت ہے۔ دعا کرتے رہیے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱؎ غلام حسین خاں سرور تبریزی، سورت کے نواب میر افضل الدین کے میر منشی تھے۔ ان کا ذکر 'تلامذۂ غالب' کے پہلے ایڈیشن میں نہ تھا۔ میں نے اشاعت ثانی میں اضافے کے لیے جن شاگردوں کے نام تجویز کیے تھے، ان میں سرور بھی شامل تھے۔ ان سے متعلق ایک مفصل تعارفی نوٹ بھی مالک رام صاحب کی خدمت میں بھیج چکا تھا۔ اس کی جانب اشارہ ہے۔

(۱۴)

C-504, Defence Colony
New Delhi–24

۱۷ر جون ۱۹۸۳ء

محبِ مکرم، آداب

آپ نے میرے گذشتہ عریضے کا جواب نہیں دیا[1]۔ اس سے خیال گزرتا ہے کہ شاید وہ آپ تک پہنچا ہی نہ ہو اور میں بیکار جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

آپ نے آغا غلام حسین سرور کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کا کلام 'سخنورانِ گجرات' سے مل سکتا ہے۔ ٹھیک! لیکن غالبؔ کے شاگرد کیونکر ہوئے ؟

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ آمین!

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

---

1. 'تلامذۂ غالب' میں ترمیمیں اور اضافوں کی غرض سے میرے تیار کردہ مفصل نوٹ، مالک رام صاحب کے کاغذات میں کہیں ادھر ادھر ہو گئے تھے جو انہیں آخر تک نہیں ملے۔ مجھے اس کا بے حد قلق تھا چنانچہ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ آئندہ اس سلسلے میں موصوف کے کسی سوال کا جواب نہ دوں گا۔ اسی ردِ عمل کے نتیجے میں میں نے 'تلامذۂ غالب' کے ذاتی نسخے پر درج اشارات، حواشی کی مدد سے اس منتشر مواد کو دوبارہ یکجا کر کے اور ایک مضمون کی شکل میں ترتیب دے کر دو ماہی 'اکادمی' لکھنؤ میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ یہ مضمون 'تلامذۂ غالب پر ایک نظر' کے عنوان سے اس رسالے کے جنوری - فروری ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہو تھا۔ 'تلامذۂ غالب' کی اشاعتِ ثانی میں اس کے حوالے بکثرت موجود ہیں۔

---

(۱۵)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۱۰ر اگست ۱۹۸۳ء

بھائی،

آپ کے خط کے ایک ایک لفظ سے ناراضی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اب کوئی عذر پیش کروں گا، تو آپ اسے عذرِ لنگ خیال کریں گے۔ بس عافیت اسی میں ہے کہ اپنا قصور تسلیم کروں حالانکہ آپ یقین فرمائیے، عذرِ معقول پیش کر سکتا ہوں۔ کتابیں اسی ہفتے میں پہنچ جائیں گی۔ ان شاء اللہ

'تلامذۂ غالب' کے تقریباً ۴۵۰ صفحات کی کتابت ہو چکی ہے، شاید ۱۵۰ صفحات اور ہوں گے۔

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

۱۔ میں نے خط نمبر ۱۳ کے جواب میں اپنے تیار کردہ نوٹس کے ضائع ہونے پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا تھا، یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ تین کتابیں جو عاریتاً بھیجی گئی تھیں، انہی کا ذکر ہے۔

C-504 Defence Colony,
New Delhi-110024

(۱۶)

۱۹/ اگست ۱۹۸۳ء

عزیزی،

آج دو کتابیں[۱] رجسٹری سے بھیجی گئی ہیں۔ تیسری کتاب[۲] تلاش کے باوجود فوری طور پر دستیاب نہیں ہوئی۔ بہر حال دیر سویر ضرور مل جائے گی۔ اس کا نسخہ خود میرے پاس بھی ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت دونوں کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اگر اس کے ملنے کا انتظار کرتا تو یہ دونوں بھی نہ بھیج سکتا۔ اس سے خیال کیا کہ فی الحال انہیں تو بھیج دوں، تیسری بعد کو چلی جائے گی۔

ان کے پہنچنے کی اطلاع دے دیجئے گا۔ شکریہ!

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱۔ میری بھیجی ہوئی تین کتابوں میں سے دو۔

۲۔ عرفانِ عزیز۔ ولایت علی خاں عزیز کے اردو کلام کا انتخاب۔

C-504, Defence Colony
New Delhi-110024

(۱۷)

۱۸/ اکتوبر ۱۹۸۳ء

محبِ مکرم، آداب

'عرفانِ عزیز' کا نسخہ بحمد ہ تعالیٰ مل گیا۔ اسے آج ہی رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔ پہنچنے کی اطلاع دے دیجئے گا۔

اس سلسلے میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جو زحمت ہوئی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ڈاکٹر تیّر سے سلام کہیے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۱۸)

C-504 Defence Colony
New Delhi-110024

۱۰ر جنوری ۱۹۸۳ء

محبِ گرامی، آداب

آپ کا تہنیت کا تار ملا[۱]۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ اعزہ و احباب کو اس موقع پر جو مسرت ہوئی ہے، اس سے میری مسرت میں اضافہ ہوا۔ فالحمد للہ 'تلامذۂ غالب' کی کتابت مکمل ہو گئی، ساڑھے پانچ سو صفحات ہو گئے۔ خدا چاہے تو اسی مہینے میں طباعت بھی مکمل ہو جائے گی۔

آپ نے جو مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیمینار میں پڑھا تھا[۲]، مجھے اس سے اختلاف ہے۔ لیکن وہاں اس سے بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ان شاء اللہ کسی وقت عرض کروں گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱۔ مالک رام صاحب کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا تھا۔ یہ اسی کی مبارکباد کا تار تھا۔

۲۔ اس مقالے کا عنوان تھا 'غالب کا سالِ ولادت'۔ اس میں مختلف دلائل و شواہد سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ غالب کی صحیح تاریخ ولادت ۱۲؍ رجب ۱۲۰۸ھ (۹؍ فروری ۱۷۹۳ء) ہے۔ انھوں نے بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے چار سال آگے بڑھا کر ۱۲؍ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷؍ دسمبر ۱۷۹۷ء) بتایا ہے۔

C-504, Defence Colony,
New Delhi-110024

(۱۹)

۲۶؍ اگست ۱۹۸۳ء

عزیز مکرم، آداب

میں نے ٹھیک لکھا تھا، لیکن ایک غیر متوقع حادثے کے باعث 'تلامذۂ غالب' کی طباعت اور پھر اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ کتاب کی طباعت ہنوز مکمل نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ آئندہ ہفتے بھر میں سب کام پورا ہو جائے۔ ان شاء اللہ

بہرحال جونہی کتاب ہاتھ میں آتی ہے، اس کا نسخہ آپ کے پاس پہنچے گا۔

خدا کرے آپ کا مزاج بہر نوع بخیر ہو۔ آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱؎ مالک رام صاحب نے ۱۰ر جنوری ۱۹۸۴ء کے خط میں یہ اطلاع دی تھی کہ خدا چاہے تو اسی مہینے طباعت مکمل ہو جائے گی، یہ اسی طرف اشارہ ہے۔
۲؎ اس کتاب کا نسخہ مجھے ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۴ء کو اس صورت میں موصول ہوا کہ اس کی جلد بالکل تازہ تھی۔

(۲۰)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۱۰ر اپریل ۱۹۸۶ء[1]

گرامی عزیز، آداب

یادآوری کا شکریہ!

میں تقریباً ڈیڑھ برس سے بہت تکلیف میں ہوں۔ پارسال میری دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ بدقسمتی سے بائیں آنکھ کا آپریشن بگڑ گیا۔ بہت مشکل سے (۲۸ ٹیکے لگوانا پڑے) کوئی تہائی یا چوتھائی بھر روشنی بحال ہوئی ہے۔ فالحمد للہ آج تک ڈاکٹروں کے چکر میں ہوں۔ خیر، آپ کو تفصیلات سے کیا پریشان کروں۔ اسی اُلجھن میں جو مختصر مضمون[2] لکھنا چاہتا تھا، وہ بھی نہ لکھ سکا۔ طالب دعا ہوں۔

میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ آپ کا استدلال ٹھیک نہیں ہے۔ صحیح تاریخ ۸ر رجب ۱۲۱۲ھ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے توفیق ملے، تو اپنے خیالات قلمبند کردوں[3]۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی رائے کی کتنی قدر کرتا ہوں لیکن اس مسئلے میں میرے نزدیک آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

آپ کے مضمون ضرور شائع ہونا چاہیں۔ اور میں کوشش کروں گا کہ مکتبۂ جامعہ ہی سے شائع ہوں[4]۔ میں اس پر مقدمہ لکھوں گا اور اس سے مجھے مسرت ہوگی۔

لیکن 'تلامذۂ غالب' والے مضمون کا شمول جب کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا، بے محل تو نہیں ہوگا بالخصوص جب کہ پہلا ایڈیشن اب ملتا بھی نہیں؟ یوں جیسا آپ مناسب خیال کریں۔

میری صحت کے لیے دعا کریں تو ممنونِ احسان ہوں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ بیکار دن نہیں کٹتا۔ اللہ رحم کرے!

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

کیا آپ کبھی دلّی نہیں آتے، ملنے کو جی چاہتا ہے۔

۱؎ مالک رام صاحب نے سنہ ۱۹۸۴ء لکھا ہے۔ یہ صریحاً سہو قلم ہے۔

۲ میرے مضمون 'غالب کا سالِ ولادت' کے جواب میں۔

۳ مالک رام صاحب کو اس موضوع پر مستقل مضمون لکھنے کا موقع تو نہ مل سکا تاہم میرے مجموعہ مضامین 'غالب احوال و آثار' کے مقدمے میں انھوں نے مختصراً اپنے دلائل قلمبند فرما دیے ہیں۔

۴ میں غالب سے متعلق اپنے مضامین یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرانا چاہتا تھا، اور اس کام کے لیے کسی مناسب ناشر کی تلاش تھی۔

---

(۲۱)

C-504, Defence Colony
New Delhi-110024

۲۶/اکتوبر ۱۹۸۶ء

عزیز گرامی، آداب

آپ کے دو تین خط آئے، اور میں شامت اعمال سے کسی کا بھی جواب نہ دے سکا۔ مجھ سے ڈاکٹر علم چند نیر نے بھی ذکر کیا تھا کہ آپ عیادت کے لیے آنے والے تھے، لیکن علی گڑھ میں کچھ الجھن پیدا ہو گئی اور آپ کو واپس جانا پڑا۱۔

میں پہلے سے بہتر ہوں، لیکن کچھ نہ کچھ چرک دھانس چلی جاتی ہے جس سے پریشان ہوں۔ کمزوری بھی ایسی ہے کہ چلنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

آپ مسودہ۲ بھیج دیجیے۔ ان شاءاللہ جو خدمت ہو سکے گی، اسے بجا لاؤں گا۔

خدا کرے آپ ہر طرح سے بخیر و عافیت ہوں۔ آمین!

پس نوشت: کل اکادمی کا تازہ شمارہ ملا۔ اس میں آپ کا مضمون دیکھا۳۔ شکریہ!

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

---

۱ یاد نہیں آتا کہ دہلی کے سفر کا ارادہ کیوں ملتوی کرنا پڑا تھا۔

۲ غالب سے متعلق مضامین کے مجموعے کا مسودہ۔

۳ 'تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر'۔ یہ مضمون 'اکادمی' لکھنؤ کے جولائی اگست ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

---

(۲۲)

C-504 Defence Colony
New Delhi-110024

۱۲/نومبر ۱۹۸۶ء

عزیز گرامی قدر، آداب

کل رجسٹری سے مسودہ۱ ملا۔ اسے تو ذرا فرصت ملے تو دیکھوں گا۔ لیکن آپ کے خط میں یہ پڑھ کر

کہ آپ کسی حادثے کا شکار ہو گئے[2] جس سے ہاتھ میں چوٹ آئی، تشویش ہوئی۔ خدا خیر کرے! اپنی صحت سے متعلق ذرا جلدی سے مطلع کر دیجیے تاکہ اطمینان ہو۔ ان شاء اللہ

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

۱ غالبؔ سے متعلق مجموعۂ مضامین کا مسودہ۔

۲ یونیورسٹی جاتے ہوئے ایک موڑ پر آٹو الٹ گیا تھا جس سے بائیں ہاتھ اور پسلیوں میں چوٹ آئی تھی۔

---

(۲۳)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء

محبِ مکرم، آداب

آپ کی جملہ مرسلہ چیزیں موصول ہوئیں۔ مضمون[1]، مولانا خیر آبادی کے مکتوب[2] کی نقل سب کا شکریہ قبول فرمائیے۔

جزاك الله و احسن الجزاء۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

۱ مضمون کے بارے میں اب کچھ یاد نہیں آتا

۲ مولانا فضل حق خیر آبادی کا خط بنام نواب یوسف علی خاں ناظم جو مولانا امتیاز علی عرشی کے مضمون کے ساتھ ماہنامہ نیا دور کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔

---

(۲۴)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۲۳ر اپریل ۱۹۸۸ء

آداب،

بھائی! آپ سے بہت شرمندہ ہوں لیکن باور کیجیے کہ جو کچھ ہوا، مجبوری سے اور غیر ارادی طور سے۔ پچھلے ڈھائی تین برس سے جس تکلیف میں مبتلا ہوں، اس کا بیان بھی خداوند کریم کی شکایت ہوگی اس لیے اس سے اجتناب کرتا ہوں۔

لیکن نیت ہمیشہ ٹھیک رہی ہے۔ آپ کے جھنجھلاہٹ اور ناراضی کے خط بھی ملے اور میں خاموش رہا کیونکہ ارادہ یہی تھا کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں مقدمہ لکھوں گا۔ الحمد للہ کہ بالآخر اسے لکھ سکا۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔ اگر پسند نہ آئے تو معافی کا خواستگار ہوں۔ اسے پھاڑ کر پھینک دیجیے[1]۔ مسودہ میرے پاس موجود ہے۔ اگر آپ کا ارادہ اسے مکتبہ جامعہ سے چھپوانے کا ہو تو میں شاہد علی خان صاحب کو بلوا کر اسے ان کے حوالے کردوں[2]۔

آپ نے اپنے مضامین کا مجموعہ (تلاش و تعارف) میرے نام معنون کرکے میری عزت افزائی کی[3]۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ کتاب کا نام بہت ثقیل ہے۔ نام ہمیشہ ایسا رکھیے جو زبان پر آسانی سے رواں ہو سکے۔ مشکل نام تو یاد بھی نہیں رہتا۔

تاخیر کے لیے پھر ایک مرتبہ معذرت خواہ ہوں۔ ڈاکٹر نیز سے سلام کہیے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

1. یہ مقدمہ غالب–احوال و آثار میں شامل ہے۔
2. مالک رام صاحب کی خواہش یہ تھی کہ تلامذۂ غالب پر میرا تبصرہ اس مجموعے میں شامل نہ ہو تو اچھا ہے۔ میں نے ان کی اس خواہش کو رد کرکے انھی کی مصارف پر مکتبہ جامعہ سے اس مجموعے کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ یہ ۱۹۹۰ء میں محترم عابد سہیل صاحب کے ادارے 'نصرت پبلیشرز' لکھنؤ سے شائع ہوا۔
3. یہ مجموعہ مضامین ۱۹۸۸ء میں نصرت پبلیشرز، امین آباد، لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔

---

(۲۵)

C-504, Defence Colony
New Delhi-110024

۱۹ نومبر ۱۹۸۸ء

عزیزی، دعوات

آپ کا گرامی نامہ ملا اور افسوس ہوا اور اس سے ایک صداقت بھی واضح ہوگئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عدالتوں میں گواہ سے قسم لی جاتی ہے کہ "میں سچ بولوں گا، کامل سچ بولوں گا، اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا" مراد یہ کہ ممکن ہے کہ انسان سچ بولے لیکن وہ بات اپنی جگہ پوری نہ ہو، اور جو حصہ اس نے چھوڑ دیا ہے، وہ کہی ہوئی بات کی تکمیل کرتا ہو، یا اس کے معنی ہی بدل دے۔ لاتقربوا الصلوٰۃ ایسے ہی مواقع پر کہا جاتا ہے۔

نجمی صاحب[1] نے مجھ سے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے انھیں جواب میں کہا "حنیف صاحب مجھے گالیاں دیتے ہوں گے کہ میں آج تک ان کا کام نہ کرسکا[2]، چونکہ میں بہت الجھا ہوا تھا، میں اس سے زیادہ کچھ

نہ کہہ سکا۔ اب انھوں نے جا کے آپ سے کیا کہا، یہ آپ کے خط سے معلوم ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عزیز من! میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ اور بحمدہ تعالیٰ میں اسی وضع پر قائم رہنا چاہتا ہوں۔ اگر میں نے کسی شخص کو دوست کہا ہے، تو میری تمنا ہے کہ اپنی دوستی کو آخر تک نبھاؤں۔ آپ میرے عزیز ہیں اور عزیز رہیں گے۔ ان شاء اللہ میری یہی دعا ہے اور خدا اسے مقبول فرمائے۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ آپ نے تجلی صاحب کے کہنے پر میرے متعلق بدگمانی کی۔

حسن ظن کا تقاضا یہ تھا اور ہے کہ اگر کوئی شخص میرے متعلق مخالفانہ بات کہے بھی، تو آپ اس پر یقین نہ کریں اور یہی خیال کریں کہ روایت میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مالک رام میرے متعلق ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ کم از کم میرا آپ سے متعلق یہی یقین ہے کہ اگر کوئی آ کے کہے کہ حنیف صاحب آپ کے بارے میں یہ (مخالفانہ) بات کہہ رہے تھے تو میں کبھی اس پر یقین نہیں کروں گا۔ بقیہ پھر۔ خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

۱۔ حسن تجلی سلطان پوری، شاعر اور صحافی (پ ۱۹۱۳۔ ف ۱۹۹۰) تجلی صاحب نے برسوں تک بنارس میں قیام کرنے کے بعد آخر عمر میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں سے بھی بھی بنارس آتے رہتے تھے۔

۲۔ غالب۔ احوال و آثار کے مقدمے کی طرف اشارہ ہے جس کے لکھنے میں بوجوہ کافی تاخیر ہوئی۔

---

(۲۶)

C-504, Defence Colony.
New Delhi–110024

۱۳؍جنوری ۱۹۸۹ء

عزیز مکرم، تسلیمات

بہت دن سے آپ کی خیر و عافیت کی خبر نہیں ملی تھی۔ آج نیر صاحب تشریف لائے۔ ان سے معلوم ہوا کہ آپ بحمدہ تعالیٰ خوش و خرم ہیں۔ اس سے اطمینان ہوا۔ فالحمد للہ

اردو اکادمی کے ماہنامے 'ایوان اردو' میں جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ کا مضمون نظر سے گزرا۔ اس میں انھوں نے نکہت سہسوانی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط شامل کیا ہے[1]، جو انھیں آپ سے حاصل ہوا تھا۔ اس سلسلے میں دو باتیں:

۱۔ نکہت مرحوم کے مختصر حالات درکار ہیں۔ وہ غالباً آپ کے نانا تھے؟

۲۔ کیا آپ کے پاس مولانا آزاد مرحوم کا کوئی اور خط ہے[2]؟ یا کیا آپ کے علم میں کسی اور کے پاس ہے؟

اگر جواب اثبات میں ہو تو، اس (ان) کی نقل یا عکس درکار ہے۔ توجہ فرمایئے۔

میری صحت روز بروز کمزور سے کمزور تر ہو رہی ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف بینائی کی ہے۔ مکبر شیشے کی مدد کے بغیر کچھ پڑھ نہیں سکتا۔

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

---

[1] یہ وہی خط ہے جس کا ذکر مکتوب نمبر ۵ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۶۹ء میں آچکا ہے۔

[2] میرے پاس مولانا آزاد کا لکھا ہوا کوئی اور خط تو نہ تھا البتہ مولانا کی طرف سے ان کے سکریٹری اجمل خاں صاحب کے لکھے ہوئے ایک دو خط ضرور تھے، جن کی نقلیں مالک رام صاحب کو بھیج دی گئی تھیں۔

C-504, Defence Colony
New Delhi-110024

(۲۷[1])

عزیزی آداب

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ امسال غالب کی ولادت کی تقریب کے موقع پر آپ کو غالب اکاڈمی[2] میں اپنا مقالہ پیش کرنا ہوگا[3]۔

امید بلکہ یقین ہے کہ آپ نے مقالہ تیار کر لیا ہوگا۔ یہ ۳۰-۳۵ منٹ کا ہونا چاہیے۔ اس کا عنوان فوراً لکھ دیجیے تاکہ اشتہار میں درج کیا جا سکے۔

میں عجلت میں ہوں اس لیے فی الحال انھیں سطروں پر اکتفا کیجیے۔ جلسہ غالباً ۲۷ دسمبر کو ہوگا۔ ان شاء اللہ!

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

---

[1] اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ ڈاک خانے کی مہر کے مطابق یہ ۲۳ نومبر ۱۹۹۰ء کو دہلی سے روانہ ہوا تھا۔

[2] غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین غالب کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کی مناسبت سے ہر سال فروری اور دسمبر میں دو جلسے منعقد کرتی ہے جن میں کسی ایک مقالہ نگار کو غالب سے متعلق کسی موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔

[3] میرے مقالے کا عنوان تھا "غالب کی فارسی مکتوب نگاری"۔

نئی دہلی

۳۰؍نومبر ۱۹۹۰ء (۲۸)

عزیزی

چند دن ہوئے، میں نے آپ کو لکھا تھا کہ دسمبر کے آخر میں غالب کی یوم ولادت کی تقریب میں غالب اکادمی کی طرف سے ہونے والے جلسے میں اپنا مقالہ پڑھیں۔

آپ کی طرف سے اس کا جواب نہیں آیا[1]۔ اگرچہ مجھے اس کا یقین ہے کہ آپ نے میری درخواست قبول کرلی ہوگی کیونکہ میں اس سے متعلق بہت پہلے آپ سے کہہ چکا ہوں۔ لیکن اس پروگرام میں ایک تبدیلی ہو گئی ہے۔ آپ کا مقالہ ان شاء اللہ فروری ۱۹۹۱ء میں ہوگا۔ یہ جلسہ ہم عموماً ۲۲؍فروری کو کیا کرتے ہیں جو اکادمی کا یوم تاسیس ہے۔ چونکہ ۱۵؍فروری کو میرزا کی تاریخ وفات ہے اس لیے اس دن بھی مقالہ غالب ہی سے متعلق ہوتا ہے۔

مقالہ ۳۰-۳۵ منٹ کا ہونا چاہیے، تاکہ اگر اسے شائع کیا جائے تو ضخامت، تنی کم نہ رہے۔

آپ بہر حال اپنا مقالہ اطمینان سے تیار کرلیں۔ فروری میں بہت دن ہیں۔ امید ہے آپ اس خفیف سی تبدیلی سے ناراض نہیں ہوں گے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

پس نوشت: دسمبر میں پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ ہوگا۔ انشاء اللہ۔
اگر آپ اس جلسے میں آسکیں تو تشریف لایئے۔

---

[1] مجھے یہ دعوت نامہ ۲۹؍نومبر کو ملا تھا اور میں نے ۳۰ نومبر کو اپنی منظوری بھیج دی تھی۔ یہ خط بھی اسی دن لکھا گیا ہے۔

نئی دہلی

۳؍دسمبر ۱۹۹۰ء (۲۹)

عزیزی

ابھی ابھی آپ کا ۳۰؍نومبر کا مکتوب گرامی ملا۔ اس دوران میں میرا دوسرا عریضہ بھی ملا ہوگا جس میں آپ کے مقالے کے لیے فروری ۱۹۹۱ء کی تاریخ کی خبر تھی۔ الحمد للہ میں من واوصلح قائد[2]۔ آپ پورے اطمینان سے مقالہ لکھیے۔ اگر اس کی ضخامت زیادہ ہوگئی تو ہم اسے الگ کتابچے کی شکل میں شائع کردیں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے کسی زمانے میں مولانا آزاد کے وہ خطوط شائع کیے تھے جو انھوں نے دریابادی کو لکھے تھے۔ غالباً یہ نیا دور[3] میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس رسالے کا

فائل وہاں آپ کے پاس ہے۔ ذرا اسے دیکھیے اور اگر یہ خط اس میں چھپے ہیں تو ان کا حوالہ درکار ہے۔ خط نہیں چاہییں، صرف حوالہ درکار ہے۔

پنج آہنگ کا نسخہ اب میرے پاس نہیں۔ میں نے اپنی دوسری کتابوں کے ساتھ اسے بھی الگ کر دیا تھا۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے سارا ذخیرہ خرید لیا تھا۔ مجھے روپوں کی ضرورت تھی، مجبور تھا۔ انھوں نے چھتیس ہزار روپے اور سب کتابیں لے گیے۔ انھیں میں یہ مخطوطہ[3] بھی تھا۔ یہ حکیم احسن اللہ خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔ میری صحت روز بروز رو بہ انحطاط ہے، خاص کر بینائی کم ہوتی جا رہی ہے۔ انکل سے لکھ تو لیتا ہوں لیکن پڑھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ لیکن کیا کروں وقت بھی نہیں گزرتا۔

نیز صاحب سے سلام کہیے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

کیا آپ کے وہاں 'مرقع عالم' (ہردوئی) کا کوئی پرچہ ہے؟
اس کے ایک پرچے میں (غالباً ۱۹۰۲ء میں) مولانا آزاد کا
ایک خط ہے۔ اس کی نقل درکار ہے۔ مالک رام

۱۔ جہاں تک یاد آتا ہے، میں نے خود بھی یہ درخواست کی تھی کہ میرا مقالہ فرہری میں رکھا جائے۔

۲۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۳ء تک

۳۔ پنج آہنگ کا یہ قلمی نسخہ پہلے کتب خانہ نذیریہ کی ملکیت تھا۔ وہاں سے مالک رام صاحب کے پاس پہنچا اور ان کے ذخیرے سے کالی داس گپتا کے کتب خانے میں منتقل ہوا۔ ع سلطنت دست بہ دست آئی ہے

نئی دہلی

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء (۳۰)

گرامی عزیز

آپ کے دونوں خط ملے۔ شکریہ!

آپ نے جس کام کے لیے لکھا تھا، یہاں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اس میں مدد دیتا۔ اس طرح کی بے انصافیاں اب زندگی کا معمول بن گئی ہیں[1]۔ دل مسوس کے رہ جانے کے سوائے ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

آپ بھی صبر کیجیے، اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

و اللہ معکم اینما کنتم[2]۔

پس نوشت: وہاں سری رام گلکشن میں حکیم آغا خاں عیش کا جو مخطوطہ ہے
اس کا نمبر کیا ہے؟ یعنی اگر کہیں اس کا حوالہ دینا ہو تو
اس کی نشاندہی کیونکر کی جائے گی؟

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

۱؎ یہ ایک انٹرویو میں میرے ساتھ ناانصافی بلکہ دھاندلی کا معاملہ تھا جس کی تفصیل میں جانا اب مناسب نہیں معلوم ہوتا۔
۲؎ سورۂ الحدید آیت نمبر ۴۔ وَ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ

نئی دہلی

۳۰؍مارچ ۱۹۹۲ء

(۳۱)

عزیز مکرم، آداب

۲۳؍مارچ کے گرامی نامے کا دلی شکریہ!

مجھے اس سے قبل آپ کا وہ خط نہیں ملا جس میں آپ نے مولانا محمد اجمل خان کے دو خط[1] بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔

دوبارہ نقل بھیجنے کی زحمت کیجیے۔

'تذکرہ ماہ و سال' کی ایک جلد میں نے آپ کے لیے نیر صاحب کے حوالے کی تھی۔ تعجب ہے کہ آپ کو موصول نہیں ہوئی۔ حال آں کہ وہ اس وقت بنارس ہی جا رہے تھے۔

ان سے دریافت کیجیے کہ وہ جلد انھوں نے کیا کی؟ غالباً ہنوز ان کے پاس پڑی ہوگی[2]۔

پچھلے دنوں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہی۔ کبرسی کا اثر تیز تر ہوگیا ہے۔ رہی سہی کسر کرنل زیدی[3] کے انتقال نے پوری کردی۔ کیا بتاؤں کہ کیا ہوگیا ہے۔ نصف صدی کا شفیق دوست بچھڑ گیا۔

اللہ کریم ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے۔ آمین!

واقعی میرا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

۱؎ ان خطوط کا ذکر مکتوب نمبر ۲۴، مورخہ ۱۳؍جنوری ۱۹۸۹ء کے حواشی میں آچکا ہے۔
۲؎ تذکرۂ ماہ و سال کی یہ جلد بعد میں مجھے مل گئی تھی۔ اس پر مالک رام صاحب کے قلم سے ۱۳؍دسمبر ۱۹۹۱ء کی تاریخ درج ہے۔
۳؎ کرنل سید بشیر حسین زیدی (پ ۱۸۹۸ء - ف ۱۹۹۲ء)

نئی دہلی

یکم جون ۱۹۹۲ء

(۳۲)

عزیزی

میری بے خبری کی داد تو نہیں دیں گے کہ مجھے آج تک معلوم نہیں تھا کہ آپ نے کوئی تذکرہ شعراے سہسوان شائع کیا ہے[1]۔ ایک مضمون میں مضمون نگار نے ضمناً اس کا ذکر کیا ہے[2]، آج اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

بہرحال بتائیے کہ کہاں سے شائع ہوا اور کہاں سے دستیاب ہوگا؟

نیر صاحب کی علالت واقعی تشویشناک ہے[3]۔ خدا انھیں جلد مکمل صحت عطا فرمائے۔ آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

1. یہ اطلاع صحیح نہیں تھی۔ 'تذکرۂ شعراے سہسوان' میرے عم محترم مولانا حکیم سید اعجاز احمد معجز سہسوانی (پ ۱۸۷۷ء - ف ۱۹۶۳ء) کی تصنیف ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔
2. اس حوالے کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔
3. پروفیسر حکیم چند نیر (پ ۱۹۳۱ء - ف ۱۹۹۴ء) کو ڈاکٹروں نے کینسر تجویز کیا تھا اور ان کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔

نئی دہلی

۲۷ر جون ۱۹۹۲ء

(۳۳)

عزیزی

واقعی نیر صاحب سے متعلق تشویش ہو رہی ہے۔ ایک زمانے سے ان کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ آج پھر لکھ رہا ہوں۔

میں نے کسی رسالے میں (غالباً ایوانِ اردو میں) کسی کا مضمون دیکھا تھا جس میں آپ کا ذکر تھا۔ انھوں نے ضمناً آپ کے نام کے ساتھ اس تذکرے کا بھی ذکر کیا تھا۔ چونکہ یہ میرے علم میں نہیں تھا، میں نے آپ سے دریافت کیا۔

تو آپ اس مسودے کو شائع کیوں نہیں کر دیتے، محفوظ ہو جائے گا اور لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

نئی دہلی

۲۲ر اکتوبر ۱۹۹۲ء (۳۴)

عزیز گرامی، آداب

مجھے بہت دن سے بخار کی شکایت ہے۔ ڈاکٹروں نے ملیریا تشخیص کیا ہے۔ خدا معلوم۔ لیکن نقاہت اس بلا کی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ بھوک بالکل ختم ہو گئی ہے۔ کھانا دیکھ تک نہیں سکتا۔

سب دوستوں سے دعا کا طالب ہوں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

پروفیسر حنیف نقوی کا

مالک رام کے نام ایک خط جو بربنائے سہو پوسٹ نہیں کیا جا سکا

بنارس

۹ر ستمبر ۱۹۹۰ء (۳۵)

مخدومی و محترمی...... تسلیم

خدا کرے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہو۔ ایک مدت سے خط لکھنے اور خیریت مزاج دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آپ اسے میری بدتوفیقی پر محمول فرمائیں تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اس دوران محترم نیر صاحب سے برابر آپ کی خیریت دریافت کرتا رہا ہوں۔

کچھ دنوں پہلے 'تحقیقی مضامین' کے بعض مضمون دوبارہ بغور پڑھنے کا اتفاق ہوا تو انشا کی تاریخ وفات کے سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بارے اس کی نوبت آج آئی ہے۔ اس سلسلے میں تین باتیں قابل گزارش ہیں۔

(۱) دستیاب تحریر میں انشا کی تاریخ وفات 'سیم جمادی الثانی، روز دوشنبہ، ۱۲۳۲ ہجری' بتائی گئی ہے۔ اسے آپ نے ۳۰ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۹ مئی ۱۸۱۷ء قرار دیا ہے۔ آپ کی تحریر کے مطابق تقویم کی رو سے جمادی الثانی کا مہینا ۲۹ دن کا ہے اور ۲۹ جمادی الثانی مطابق ہے جمعہ، ۱۶ مئی ۱۸۱۷ء کے۔ لیکن دستیاب تحریر کو معاصر شہادت قرار دیتے ہوئے آپ نے اس فرق کو نظر انداز کر دینے کا مشورہ دیا ہے جو اصولی طور پر بالکل درست ہے۔ لیکن یہاں معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اس تحریر میں 'سیم' سے تیسویں نہیں، تیسری تاریخ مراد

ہے۔ فارسی والے 'تیسرے' کو 'سیم' اور 'تیسویں' کو 'سی ام' لکھتے ہیں۔ 'تیسرے' کے معنی میں 'سیم' کے استعمال کی جو مثالیں اس وقت پیش نظر ہیں، ان میں مصحفی کے دیوان ششم کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس دیوان کے دو قلمی نسخوں (مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ و کتب خانہ محمود آباد) میں تیسرے دیوان کو 'دیوان سیم' لکھا گیا ہے۔ دوسری مثال مشہور مرثیہ گو میر ضمیر کی تاریخ وفات کی ہے۔ ضمیر کا انتقال بالاتفاق، شنبہ، ۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ کو ہوا ہے۔ مہدی علی قبول نے ان کی رحلت کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی ہے:

ع شنبہ و بست و سیم بود از محرم آہ و وائے

اسی نہج پر انشا کی تاریخ وفات دوشنبہ، ۳ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ قرار پائے گی۔ تقویم کے مطابق ۳ رجمادی الثانی ۱۲۳۲ھ کو یکشنبہ کا دن اور اپریل ۱۸۱۷ء کی بیسویں تاریخ تھی۔ اس طرح اصل تحریر اور تقویم کے تخمینی حساب میں صرف ایک دن کا فرق باقی رہ جاتا ہے جو معمول کے مطابق ہے۔

(۲) کاتب تحریر نے اپنے نام (سید عبد المسیح) اور سید انشاء اللہ کے درمیان سے ایک لفظ کو قلمزد کر کے اس کے نیچے کچھ اور لکھا ہے جسے آپ نہیں پڑھ سکے ہیں۔ میرے خیال میں جو لفظ قلمزد کیا گیا ہے وہ بالیقین 'نبیرہ' ہے جو پوتا اور نواسا دونوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے نیچے جو لفظ لکھا گیا ہے وہ 'نوادہ' ہے جسے بعض لوگ 'نودہ' بھی لکھتے ہیں۔ یہ صرف پوتے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا کاتب انشا کا پوتا ہے۔

(۳) آپ نے پروفیسر عابد پیشاوری کے ایک اعتراض کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ عبد المسیح اور مسیح اللہ دونوں کے معنی ایک ہیں اور عبد المسیح کی طرح مسیح اللہ بھی غیر اسلامی نام ہے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ 'مسیح اللہ' خالص اسلامی نام ہے جب کہ 'عبد المسیح' مشرکانہ یا غیر اسلامی ہے۔ 'مسیح' حضرت عیسیٰ کا نام نہیں، لقب ہے اور اصل لقب صرف 'مسیح' نہیں بلکہ 'مسیح اللہ' ہے۔ 'مسیح' کے معنی ہیں 'دوست'۔ حضرت عیسیٰ اللہ کے دوست تھے اس لیے 'مسیح اللہ' کے لقب سے مشہور ہوئے جس طرح حضرت ابراہیم 'خلیل اللہ' کے لقب سے مشہور ہیں۔ عام طور پر جس طرح 'خلیل اللہ' کے بجائے صرف 'خلیل' کہا اور لکھا جاتا ہے، اسی طرح 'مسیح اللہ' کی بجائے صرف 'مسیح' رائج ہے اور اگر خلیل اللہ یا حبیب اللہ نام ہو سکتا ہے تو مسیح اللہ میں بھی کوئی قباحت نہیں۔

'عبد المسیح' یقیناً غیر اسلامی نام ہے لیکن اس کے جواز میں عبد النبی، عبد الرسول، عبد المصطفےٰ اور عبد الحسن وغیرہ کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ 'عبد المصطفےٰ' بریلوی العقیدہ حضرات کے نزدیک بالکل درست ہے۔ 'عبد الحسن' اور 'عبد الحسین' بوہروں اور شیعوں میں بہت عام ہیں۔ مثال 'عبد العلی' کی بھی دی جا سکتی ہے لیکن 'علی' خدا کا نام بھی ہے، اس لیے اس سے صرف نظر بہتر ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ ہندی کے ایک استاد کا نام 'عبد البسم اللہ' ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انشا کے اس پوتے نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کی بنا پر تبدیلیِ مذہب کر کے عیسائیت قبول کر لی ہو۔ اس صورت میں 'عبد المسیح' کے جواز کی ایک اور گنجائش نکل آتی ہے

اور یہ قرینہ سب سے زیادہ قوی ہے۔

اگر یہ معروضات آپ کے نزدیک قابلِ اعتنا ہوں تو ان کی روشنی میں ایک مختصر وضاحتی مضمون لکھ کر 'ہماری زبان' میں شائع کرا دیجیے اور اگر آپ کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھتے ہوں تو مجھے اجازت دیجیے کیونکہ تحقیقی نقطۂ نظر سے ان پہلوؤں کی وضاحت ضروری ہوتی ہے۔

امید ہے کہ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

نیازمند

حنیف نقوی

بخدمت گرامی مخدومی و محترمی جناب مالک رام قبلہ

C504 - ڈیفنس کالونی، نئی دہلی (۱۱۰۰۲۴)

---

(۳۶)

C-504, Defence Colony
New Delhi–110024

۲۵ر اگست ۱۹۷۷ء

مکرمی جناب ڈاکٹر عزیز صاحب*، آداب

۲۰ر اگست کے گرامی نامے کا شکریہ!

یہاں سے ایک صاحب جانے والے تھے وہ تو پاکستان چلے گئے۔ اب فوری طور پر یہاں سے بھیجنے کا انتظام نہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ مائکروفلم[1] ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کے حوالے کر دیا جائے وہ کسی جانے والے اپنے عزیز کے ہاتھ بھجوا دیں گے۔ پس میری درخواست ہے کہ آپ اسے انھیں دے کر یہ ہدایت کریں کہ وہ اسے مشفق خواجہ صاحب کے پاس بھیج دیں۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں کہ وہ اپنے کام میں بنارس یونیورسٹی لائبریری کا مناسب ذکر کریں گے۔ بھلا اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے! اور پھر وہ کوئی کام ایسا کیوں کریں گے جس سے آپ کو ندامت ہو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم

ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب سے کہیے کہ وہ مجھے خط لکھیں۔ انھیں میرا پتا معلوم نہیں، یہ بتا دیجیے گا۔

مائکروفلم پر کیا خرچ آیا؟

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

---

* یہ خط پروفیسر حکم چند نیر (صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) کے نام ضرور ہے لیکن اس کا تعلق بھی چونکہ پروفیسر حنیف نقوی صاحب سے ہے اس لیے اسے سب سے آخر میں درج کیا جا رہا ہے۔ [مدیر]

1. یہ قاضی محمد صادق خاں اختر کے دیوان کی مائکروفلم تھی جس کا ایک قلمی نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے مکتوب موسومہ حنیف نقوی مورخہ ۲۳ر اپریل ۱۹۷۸ء کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

❁

نظیر صدیقی کے خطوط ڈاکٹر سید حسن عباس کے نام

اسلام آباد (پاکستان)

۸۸/۹/۱۲ء

(۱)

محترمی حسن عباس صاحب، السلام علیکم

عنایت نامہ مورخہ ۲۷راگست ایک خوشگوار حیرت کے طور پر ملا۔ اگر پچھلے سال آپ سے ملاقات ہو جاتی تو مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی۔ آپ کے خط سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ عزیزی جلال اصغر فریدی سے آپ کی عزیزداری ہے یا نہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ میرے عزیزوں میں سے ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ میری عزیزداری نہ بھی ہو تو یہی کیا کم ہے کہ آپ میرے ہم وطنوں میں سے ہیں۔ میرا تعلق موضع سرائے ساہو ضلع چھپرا سے ہے۔ پچھلے پانچ چھ سال کے دوران مجھے دو تین مرتبہ ہندوستان کے بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کا موقع ملا اور بہت سے لوگوں سے تعلقات کی تجدید ہوئی۔ ویسے آپ کو معلوم ہے کہ خود اپنے وطن کے لیے غریب الوطن بن چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ جلال اصغر کے ذریعہ میری کم از کم ایک کتاب آپ تک پہنچی اور ایک ایسی کتاب پہنچی جو آپ سے میرے تعارف کا ایک نہایت عمدہ ذریعہ ثابت ہوگی۔ آپ کے پاس 'شہرت کی خاطر' کا غالباً ہندوستانی ایڈیشن ہوگا جس میں پاکستانی ایڈیشن سے ایک انشائیہ کم ہے۔ میری ایک اور کتاب 'میرے خیال میں' کا ہندوستانی ایڈیشن موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲ سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ میرے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جو پہلے مجموعے (تاثرات وتعصبات) کی طرح پاکستان میں گزشتہ ۱۸ سال سے نایاب ہے۔ جب کوئی پبلشر ملتا ہے تو اپنی کوئی نئی کتاب چھپوا لیتا ہوں۔ اس وقت تک ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میرے پاس ہر کتاب کی ایک ایک جلد رہ گئی ہے۔ کتابیں خرید کر بھیجنا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ ان دنوں ایک مکان کی تعمیر وتکمیل میں لگا ہوا ہوں جس نے مجھے غریب تر کر دیا ہے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ جیسا باذوق صاحب قلم میرے قارئین میں سے ہو۔ ماہ رواں میں راولپنڈی سے میری ایک کتاب 'دو سفر نامے' (ایک سفر نامہ لندن کا ہے دوسرا کلکتے اور بمبئی کا) شائع ہونے والی ہے اور اکتوبر میں میری ایک انگریزی کتاب Iqbal and Radhakrishnan بیک وقت ہندوستان (نئی دہلی) اور پاکستان (راولپنڈی) سے شائع ہونے والی ہے۔

میں آپ کی کتاب 'جذب گوپالپوری' ضرور دیکھوں گا اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ بھیجوں گا۔ میں جذبؔ کے نام اور کلام سے اب تک بالکل ناواقف رہا ہوں۔ خدا کرے وہ جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی (ان دونوں پر میرے مضامین میری دو کتابوں میں موجود ہیں) کی طرح ہم لوگوں کے لیے باعث فخر ہوں اور اگر نہ ہوں تو ہمارے وطن کے لیے جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کا ہونا کافی ہے۔

آپ کے جو احباب آپ کی وساطت سے مجھے جانتے ہیں ان کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے۔ آپ سے ملاقات تو نہ جانے کب ہوگی۔ آپ کا دیدار فوٹو کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ چونکہ آپ میں بھی مجھ سے ملنے اور مجھے دیکھنے کی فطری خواہش موجود ہوگی، اس لیے تصویر بھیجنے کے سلسلے میں خود میں پہل کرتا ہوں۔ باقی آئندہ

مخلص

نظیر صدیقی

---

1 اس خط کے ہمراہ پاسپورٹ سائز کی ایک سیاہ وسفید تصویر بھی موصول ہوئی تھی۔

---

(۲)

حسن عباس صاحب محترم، السلام علیکم

آپ مجھے استاد نہ کہیں، میرے دوست ہیں۔ آپ کا خط مورخہ ۱۸ر اکتوبر[1] مجھے ۲۹ر اکتوبر کو مل گیا تھا۔ اس سے پہلے 'قصائد جذب' کا مسودہ بھی مل گیا تھا۔ اکتوبر سے لے کر تادم تحریر میں بے حد مصروف رہا ہوں۔ اس لیے مسودے اور خط کی رسید تک نہ بھیج سکا۔ مسودہ پڑھنے کے بعد کچھ عرض کروں گا۔ ویسے ایک بات ظاہر ہے کہ قصیدے میں اردو کا کوئی شاعر سوداؔ اور ذوقؔ کو پہنچ نہ سکا اور اب اگر کوئی ان دونوں کے اردگرد پہنچ بھی جائے تو چونکہ اب قصیدے کی شاعری کی کوئی اہمیت ہی باقی نہ رہی اس لیے اب کسی کا سوداؔ اور ذوقؔ کے قریب پہنچنا بھی بے سود ہے۔ قصیدہ گوئی شاعری سے زیادہ حصول معاش کا ذریعہ تھی[2]۔ مجھے قصیدے میں اعلیٰ درجے کی شاعری بہت کم نظر آتی ہے اور جتنی شاعری غالبؔ کے ہاں نظر آتی ہے اتنی کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی۔ سو غالبؔ کا بھی اصل کمال قصیدے میں نہیں، غزل میں ظاہر ہوا ہے۔ بہر حال آپ نے جذبؔ کی قصیدہ نگاری پر جو تحقیق محنت کی ہے وہ اپنی جگہ قابل داد ہے۔

'دو سفر نامے' کا سرورق ابھی تک شائع نہ ہوسکا، لہٰذا وہ کتاب ابھی تک بازار میں نہ آسکی۔ آپ ڈاکٹر ولی[3] کا پتا بھیج دیں، کوشش کروں گا کہ یہ کتاب ان تک پہنچ جائے۔

ڈاکٹر مہر میرے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ ایک اور ذریعے سے بھی ان کا سلام پہنچا ہے۔ آپ میرا

سلام ان کی خدمت میں پہنچائیں اور ان کی خیریت سے مطلع کرتے رہیں۔

ملتان یونیورسٹی کی دعوت پر آج تین دن کے لیے ملتان جا رہا ہوں۔ واپسی کے بعد 'قصائد جذبؔ' دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ آپ شعر و ادب کے جدید موضوعات سے دلچسپی لیں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

نظیر صدیقی

۱؎ اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۸۸ء کے بعد کا ہی لکھا ہوا ہے۔ غالباً نومبر میں لکھا ہوگا۔

۲؎ 'قصائد جذبؔ' محمد و آل محمدؐ کی مدح میں ہیں۔ وہ قصائد جو عقیدت کے جذبات سے لبریز ہو کر لکھے گئے ہیں ان میں بھی اعلا شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ یہ حصول معاش کا نہیں بلکہ سعادت دارین کا ذریعہ ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے چھپی۔

۳؎ ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ مظفر پوری میرے ہم سبق۔ بی-اے (اردو آنرز) سے لے کر اب تک ہمارے درمیان ایک گونہ انسیت و محبت برقرار ہے۔ ایم-اے (اردو) کی طالب علمی کے زمانے میں ہم دونوں نے مظفر پور میں 'ادراک' کی طرح ڈالی تھی۔ 'ادراک' کا پہلا شمارہ استاد محترم پروفیسر قمر اعظم ہاشمی (سابق صدر شعبۂ اردو لنگٹ سنگھ کالج مظفر پور) کی نگرانی میں جولائی ۱۹۸۲ء میں ۸۰ صفحات پر مشتمل میگزین سائز میں منظر عام پر آیا۔ اس کی ادارت میں محمد سلیم اللہ، ولی احمد ولیؔ اور سید حسن عباس کا نام شامل تھا۔ دوسرا تیسرا شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء اور شمارہ نمبر ۴ تا ۶، جنوری ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد یہ بند ہو گیا۔ پھر میں نے جنوری ۲۰۰۱ء میں گوپال پور (سیوان) سے اس کی تجدید اشاعت کا عمل شروع کیا۔ اس کے پہلے شمارے میں 'ادراک' مظفر پور کے شماروں کا اشاریہ بھی شائع کر دیا گیا ہے۔

اسلام آباد (پاکستان)

۸۸/۱۲/۱۹ء

(۳)

برادرِ عزیز، السلام علیکم

آپ کے دونوں خط (مورخہ ۲۳ نومبر اور ۷/دسمبر) مل گئے تھے۔ حسب فرمائش 'قصائد جذبؔ' پر ایک نظر ڈال کر اسے واپس بھیج رہا ہوں۔ جس موضوع پر مقالے پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند مل چکی ہے اس کے بارے میں کیا کہنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جذبؔ مرحوم ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ان کی طبیعت کو قصیدہ نگاری سے خاص مناسبت تھی۔ کاش وہ سترہویں یا اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوئے ہوتے۔ اس زمانے میں انہیں ان کا مقام مل جاتا۔ بیسویں صدی کی شاعری میں قصیدے کی گنجائش نہیں رہی۔ آپ اپنا مقالہ اردو اکادمی میں ضرور داخل کر دیں تاکہ جذبؔ کا کلام اور اس پر آپ کا کام دونوں محفوظ ہو جائیں۔ علمی نقطۂ نظر سے علمی و ادبی سرمائے کا تحفظ ضروری ہے۔

حافظ شیرازی کانفرنس میں ہماری یونیورسٹی سے میرے دو رفقائے کار ڈاکٹر محمد ریاض (صدر شعبۂ اقبالیات) اور پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی (رجسٹرار یونیورسٹی) شرکت کے لئے شیراز گئے تھے۔ ڈاکٹر مہر، ڈاکٹر ریاض اور ڈاکٹر شبلی کے ہم درس (پی۔ ایچ۔ ڈی میں) رہے ہیں اور تینوں نے طہران ہی سے پی۔ ایچ ڈی کی ہے۔ انہیں لوگوں کے ساتھ بہار کے ڈاکٹر کلیم سہسرامی بھی تھے جو میرے دوستوں میں سے ہیں اور آج کل بنگلہ دیش میں ہیں۔

ہندوستان میں میری کتاب Iqbal and Radhaknshnan ۸ر دسمبر کو نئی دہلی سے شائع ہونے والی تھی۔ امید ہے شائع ہوگئی ہوگی۔ ابھی یہاں نہیں پہنچی۔ کتاب کے پبلشر کا پتا یہ ہے:

Sterling Publishers Private Ltd
L-10 Green Park Extension,
New Delhi–110016

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ نیا سال مبارک ہو۔

خیریت کا طالب
نظیر صدیقی

---

[1] میرے پی ایچ ڈی (اردو) کے تحقیقی مقالے کا عنوان 'قصائد جذب کی تدوین' نہیں بلکہ 'بہار میں اردو مرثیہ نگاری' تھا۔ جس پر جون ۱۹۸۸ء میں بہار یونیورسٹی مظفر پور نے سند سے نوازا۔ پروفیسر نظیر صدیقی کو اشتباہ ہوگیا تھا۔

Prof Nazeer Siddiqi
Chairman, Department of Urdu
Allama Iqbal Open University
Islamabad Pakistan
Off: 856034, Res: 413584
Dated: 5 7 1990

(۴)

عزیز مکرم، السلام علیکم

آپ کے دونوں خط ملے۔ پہلے خط کا جواب نہ دے سکنے کا نہایت افسوس ہے۔ ادھر کئی مہینے سے کچھ خاص حالات کا شکار رہا ہوں۔ بیگم گزشتہ چھ سات مہینے سے بیمار ہیں۔ اب رو بہ صحت ہیں مگر صحت یابی کی رفتار نہایت سست ہے۔ بیگم کے علاوہ میرا ایک چھوٹا بھائی جو اسلام آباد کے ایک فیڈرل گورنمنٹ کالج میں اردو کا لکچرار ہے، گزشتہ ایک سال سے بیمار ہے۔ پچھلے چھ مہینے کے اندر اس کے مرض میں ناقابل برداشت شدت پیدا ہوگئی۔ گلے میں درد کے باعث کھانے پینے سے معذور ہوگیا۔ یہاں کے ڈاکٹروں نے اس کے مرض کو ایک مہلک فالج قرار دیا اور اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے۔ ڈھائی تین مہینے سے وہ علاج کے لیے کراچی میں ہے۔ وہاں کے تین ڈاکٹروں نے اس کے مرض کو کینسر قرار دیا ہے۔ علاج جاری ہے۔ میں ۷ر نومبر سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ مجھے ریٹائرمنٹ کے بعد کم از کم دو سال کے لیے ملازمت کی شدید ضرورت ہے اور یہاں (پاکستان میں)

کسی اچھی ملازمت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ وہ حالات ہیں جن کی بنا پر بعض اوقات خط کا جواب لکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے مالی حالات ایسے ہیں کہ میں اپنی کوئی کتاب خرید کر بھیج نہیں سکتا۔ چونکہ آپ میرے سفرنامے کے لیے بہت مُصر ہیں اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ڈاکٹر ریاض یا عارف نوشاہی صاحب کے ہاتھ اپنی ذاتی کاپی آپ کے لیے بھیج دوں گا۔ ہندوستان میں خدا بخش لائبریری میں میری تقریباً تمام کتابیں موجود ہیں۔

۱۹۸۷ء میں جب میں اقبالؔ سے متعلق ایک بین الاقوامی سیمنار میں علی گڑھ گیا تھا تو مجھے مظفر پور جانے کا بھی موقع ملا تھا۔ مظفر پور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی نے اصرار کیا تھا کہ مجھ پر پی. ایچ. ڈی کا کام ہونا چاہئے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے ایک طالب علم رضی حیدر کا نام تجویز کیا۔ میرا ایک لمبا سا انٹرویو ٹیپ ریکارڈ کیا اور مجھ سے تعاون کی خواہش کی۔ میں نے اپنی کئی کتابیں اور کتابوں سے متعلق مضامین اور تبصرے وغیرہ رضی حیدر کے نام بھیج دیئے۔ پی. ایچ. ڈی کا خاکہ بنا دیا۔ اتنا مواد فراہم کر دیا کہ اگر رضی حیدر میرے مقرر کردہ عنوانات کے چوکھٹے میں میرا فراہم کردہ مواد ڈال دیتے تو ان کا مقالہ تیار ہو جاتا۔ شروع شروع میں انھوں نے اور ڈاکٹر قمر اعظم نے مجھ سے خط و کتابت بھی کی۔ پھر دونوں نے میرے خطوں کا جواب دینا ترک کر دیا۔ میں نے اپنے بھانجے جلال اصغر فریدی کو دو ایک خط لکھے کہ وہ صرف اتنا معلوم کر کے بتا دیں کہ ڈاکٹر قمر اعظم اور رضی حیدر نے میرے خطوں کا جواب دینا کیوں ترک کر دیا۔ لیکن جلال اصغر نے میرے ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ اگر آپ اپنے وسائل سے یہ راز معلوم کر سکتے ہوں تو معلوم کر کے بتائیں کہ یہ قصہ کیا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ مجھ پر پی. ایچ. ڈی کا کام نہ ہو سکا۔ جو چاہے گا اپنے فائدے کے لیے یہ کام کرے گا۔ لیکن میں اتنا ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ جو کام اُن لوگوں کے اصرار سے شروع ہوا تھا وہ کیوں رُک گیا۔

میرے سفرنامے سے کئی گنا زیادہ اہم میری انگریزی کتاب 'اقبال اینڈ رادھا کرشنن' ہے جسے Sterling Publication Ltd., L-10 Green Park Extension New Delhi-110016 نے شائع کی ہے۔ قیمت 125.00 روپے ہے۔ اسے آپ پڑھیں اور دوسروں کو پڑھوائیں۔ خدا بخش لائبریری میں یہ کتاب بھی موجود ہے۔

کیا آپ کے ریڈیو کے انگریزی یا اردو سیکشن میں میرے لیے کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر مہر سے میرا سلام کہیے۔

مخلص

نظیر صدیقی

✿

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

گل ہوئے جاتے ہیں چراغ اپنے

(مشفق خواجہ کی یاد میں)

مشفق خواجہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ممتاز محقق، نقاد اور خوش فکر شاعر تھے۔ ایک سے زاید موقر رسالوں کے مدیر رہ چکے تھے۔ کالم نویس اور طنز و مزاح نگار تھے۔ عالم اور دانشور تھے۔ علم و ادب کے ہر شعبے میں انھیں اختصاص اور امتیاز حاصل تھا۔ ان کی انفرادیت کے نقوش ہر جگہ روشن ہیں۔ وہ اسم با مسمیٰ شخصیت کے حامل، بے حد شفیق، نرم مزاج اور دردمند طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی مہمان نوازی ایک عالم میں مشہور رہی ہے۔ ن سے مل کر زندگی کی اعلا قدروں پر یقین اور پختہ ہو جاتا تھا۔ مروت، اخلاص، انسانیت، شرافت اور حسن اخلاق کا ایک نادر نمونہ تھے۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، کا فقرہ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ سستی شہرت اور نام و نمود سے بے نیاز ہو کر جس طرح انہوں نے پوری زندگی علمی کاموں کے لئے وقف کر دی تھی س کی مثال برصغیر میں اب نہیں مل سکتی۔ صحیح معنوں میں وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے جانشین تھے۔

مشفق خواجہ کی پیدائش ۱۹/ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور کے ایک علمی گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید صاحب محکمۂ اطلاعات میں ملازم تھے۔ وہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے عالم، مصنف اور مضمون نگار تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قایم کیا تھا تا کہ نوجوانوں کو اسلامی تاریخ و تمدن سے دلچسپی پیدا ہو۔ مشفق خواجہ کے سگے تایا خواجہ عبدالمجید 'جامع اللغات' (۴ جلدیں) کے مولف تھے۔ خواجہ صاحب کے خاندان والوں سے علامہ اقبال کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مشفق خواجہ کے والد نے ہی پہلی بار علامہ اقبال کی زندگی میں یوم اقبال (۱۹۳۲ء میں) کا انعقاد کیا تھا۔ بعد میں ان کا ایک طویل مضمون بھی 'نقوش' کے اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں شایع ہوا۔

مشفق خواجہ لاہور کے سناتن دھرم ہائی اسکول میں ابھی چوتھی جماعت کے طالب علم تھے کہ ملک تقسیم ہوا اور ان کے والد کا تبادلہ لاہور سے کراچی ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے ۱۹۵۲ء میں کراچی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور وہاں کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس وقت تک وہ بچوں کے ادیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ 'امروز' کراچی میں بچوں کے متعلق ان کی بہت سی تخلیقات شایع ہو چکی تھیں۔ کالج میگزین میں بھی انھوں نے

مضمون لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے بی اے آنرز کی ڈگری لی۔ اسی زمانے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق سے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں ان کی ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب کی علمی لگن اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مولوی صاحب نے انھیں انجمن کے ماہنامہ 'قومی زبان' اور پھر سہ ماہی 'اردو' کا ایڈیٹر بنا دیا۔ یہ دونوں رسالے تقریباً بیس سال تک مشفق خواجہ کی ادارت میں شایع ہوئے اور ان کا تحقیقی و تنقیدی معیار بلند ہوتا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں مشفق خواجہ نے کراچی یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ اردو میں ایم اے کیا اور انجمن میں شعبۂ تحقیق و مطبوعات کے نگراں اور قاموس الکتب اردو کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ انجمن کے علمی امور کے مشیر بھی رہے۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک مشفق خواجہ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کی ملازمت سے باقاعدہ طور پر وابستہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے خود کو تحقیق و تصنیف اور علمی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ سب سے پہلے سعادت خاں ناصر کے تذکرہ 'خوش معرکۂ زیبا' کو انھوں نے دو جلدوں میں تدوین متن کے اعلا معیار کے ساتھ مرتب کیا۔ یہ دونوں جلدیں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں شایع ہوئیں۔ ان کی دوسری کتاب 'پرانے شاعر، نیا کلام' کے نام سے کراچی کے سہ ماہی رسالہ 'غالب' میں بالاقساط شایع ہوئی جو اردو کے چند اہم کلاسیکی شعرا کے سوانحی حالات تبصرۂ کلام اور نمونۂ کلام پر مبنی ہے۔ اقبالیات سے بھی مشفق خواجہ کو گہری دلچسپی تھی۔ اقبال کے فکر و فن پر اردو میں پہلی کتاب مشفق خواجہ کے رشتے کے دادا اور 'سرگزشت الفاظ' کے مصنف مولوی احمد دین نے لکھی تھی جو ۱۹۲۳ء میں طبع ہو کر بھی منظر عام پر نہ آئی اور بعض وجوہ سے نذر آتش کر دی گئی۔ ۱۹۲۶ء میں اس کے پہلے ایڈیشن کے بعض حصوں کو حذف کر کے مصنف نے کچھ نئے مباحث کا اضافہ کر کے اسے شایع کیا مگر یہ ایڈیشن بھی کمیاب تھا۔ مشفق خواجہ نے اس کے ۱۹۲۳ء والے نایاب نسخے کو بھی ڈھونڈ نکالا اور اس کی دونوں اشاعتوں کے تمام مباحث کو صراحت کے ساتھ بالترتیب یکجا کیا۔ اس پر ایک طویل مقدمہ لکھا اور مصنف کے حالات زندگی اور علمی کاموں کی تفصیلات کے ساتھ اسے ۱۹۷۹ء میں شایع کیا۔

مشفق خواجہ کی کتاب 'غالب اور صفیر بلگرامی' کراچی سے ۱۹۸۱ء میں شایع ہوئی تو اسے 'غالبیات' میں ایک اہم اضافہ قرار دیا گیا۔ غالب نے اپنے شاگرد صفیر بلگرامی کے نام نصف درجن خطوط لکھے تھے، انھیں بھی مشفق خواجہ نے مکمل طور پر صحیح متن کے ساتھ اس کتاب میں پیش کر دیا۔ اس طرح صفیر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام اور ان کی تصانیف کی تفصیلات بھی پہلی بار اسی کتاب کے ذریعہ منظر عام پر آئیں۔ غالب اور صفیر کے تعلق سے جو معلومات اور حقائق خواجہ صاحب نے پیش کر دیے ہیں، وہ ان کی تحقیقی نظر، وسعت مطالعہ اور باریک بینی کا ثبوت ہے۔

'جائزۂ مخطوطاتِ اردو' مشفق خواجہ کا ایک بے مثل تحقیقی کارنامہ ہے۔ اسے انھوں نے دس جلدوں میں مکمل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ۱۲۵۶ صفحات پر مشتمل اس کی پہلی جلد ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شایع ہوئی۔ اس میں تقریباً دو سو (۲۰۰) ایسے مخطوطات کا تعارف شامل ہے جو پاکستان کے مختلف سرکاری، غیر سرکاری اور

ذاتی کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مخطوطات کے بارے میں ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ مخطوطے کے دیگر نسخوں، مصنف کے حالات اور مآخذ کا مفصل تذکرہ اور جائزہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس طرح یہ کام صرف مخطوطات کی وضاحتی فہرست تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس نے ایک سوانحی اور کتابیاتی جائزے کی صورت اختیار کر لی۔ اس کتاب سے اردو میں معیاری اور علمی تحقیق کی راہ ہموار ہوئی اور سیکڑوں اہم موضوعات سے متعلق مآخذ کا سراغ پالینا آسان ہوگیا۔ جائزۂ مخطوطات کی باقی نو (۹) جلدوں پر خواجہ صاحب نے اخیر عمر تک مسلسل کام کیا لیکن خوب سے خوب تر کی جستجو میں انھوں نے اس کی اشاعت کو موقوف کردیا۔ اس کتاب کے سلسلے میں رشید حسن خاں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ 'خواجہ صاحب نے تنِ تنہا وہ کام کردکھایا ہے جو بظاہر ایک ادارے کا کام معلوم ہوتا ہے'۔

'کلیاتِ یگانہ' کی تاریخی ترتیب و تدوین بھی مشفق خواجہ کا ایک اہم کام ہے۔ ۹۵۸ صفحے کا یہ کلیات ۲۰۰۳ء میں شایع ہوا۔ اس میں یگانہ کے مطبوعہ مجموعوں کے ساتھ ساتھ ان کی نوشتہ بیاضوں، خطوں اور ہم عصر ادبی رسایل سے تلاش و جستجو کے بعد یاس یگانہ چنگیزی کا کلام حاصل کرکے اسے تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس پر ایک تفصیلی دیباچہ لکھا ہے جس میں یگانہ کے سوانحی حالات، ان کی شاعری سے متعلق ضروری تفصیلات کو تحقیقی ژرف نگاری اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے اور آخر میں تین سو (۳۰۰) صفحات پر مشتمل حواشی ہیں جن کے ذریعہ کلیات میں شامل ہر غزل اور ہر رباعی کا زمانہ تصنیف مآخذ کی نشاندہی کے ساتھ متعین کیا گیا ہے۔ یگانہ نے اپنے کلام پر جو اصلاحیں اور ترمیمیں کی ہیں، ان کی تفصیلات بھی مشفق خواجہ نے پیش کی ہیں اور آخر میں فرہنگ شامل کرکے شاعر کے مطلوبہ معانی تک پہنچنے میں قاری کے لیے بھی سہولت فراہم کردی ہے۔ خواجہ صاحب کا مرتب کردہ یہ کلیات اردو میں تدوینِ متن کی منفرد مثال ہے۔ اس سے پہلے کالی داس گپتا رضا نے دیوانِ غالب کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا تھا اور اب خواجہ صاحب نے یگانہ کے کلام کو اس انداز سے مرتب کیا ہے۔ اس سے ہمیں شاعر کے تخلیقی محرکات کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ کون سی غزل، رباعی یا شعر کس زمانے میں اس نے کہا تھا تو اس کے معانی و مفاہیم کو بھی صحیح تناظر میں بہتر طور پر سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

واجد علی شاہ کے بھائی مرزا سلیمان قدر کا روزنامچہ 'فرمانِ سلیمانی' جو کہ انیسویں صدی کے لکھنؤ کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کا مرقع اور مستند تاریخی دستاویز ہے، اسے بھی مشفق خواجہ نے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا تھا لیکن اسے مطبوعہ صورت میں وہ دیکھ بھی نہ سکے۔ سلیمان قدر کا یہ روزنامچہ اندر سبھا کے مصنف امانت لکھنوی کے بیٹے لطافت حسین نے لکھا تھا۔

مشفق خواجہ ایک خوش فکر شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انھوں نے نثر میں شاعری اور شاعری میں ساحری کی کیفیت پیدا کی۔ روزنامہ 'جسارت' اور ہفت روزہ 'تکبیر' (کراچی) میں 'خامہ بگوش' کے قلمی نام سے

انھوں نے جو ادبی کالم لکھے، وہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کالموں کا انتخاب تین جلدوں میں مشہور نقاد مظفر علی سید مرحوم نے مرتب کیا۔ پہلی جلد بعنوان 'خامہ بگوش کے قلم سے' مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی اور باقی دو جلدیں 'سخن در سخن' اور 'سخن ہائے ناگفتنی' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں کراچی سے شائع ہوئیں۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'تحقیق نامہ' بھی چند سال قبل مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے[1]۔ مشفق خواجہ نے ۱۹۸۰ء میں ایک ضخیم رسالہ 'تخلیقی ادب' کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس کے پانچ شمارے منظر عام پر آئے اور ہر شمارہ ایک خصوصی نمبر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں جب مشفق خواجہ کا شعری مجموعہ 'ابیات' منظر عام پر آیا تو اسے ہم عصر شعری روایت میں قابلِ قدر اضافہ قرار دیا گیا۔ ان کے کچھ اشعار جو اس وقت یاد آتے ہیں، یہ ہیں ـ

(۱) تم خلوتِ غم سے نکلو تو اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں
اک بار جو ان کو دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

(۲) کیا اٹھتے بیٹھتے سوچتے ہو، کیا لکھتے پڑھتے رہتے ہو
اس عمر میں یہ بے کیفی کیوں، کس واسطے نیک اطوار ہوئے

(۳) یوں دیکھتا ہوں نقشِ قدم ہائے رفتگاں
جیسے بچھڑ گیا ہوں کسی کارواں سے میں

(۴) پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اُس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا

مشفق خواجہ نے ریڈیو کے لیے بھی ایک ہزار سے زیادہ اسکرپٹ لکھے۔ ان کی اہلیہ آمنہ صدیقی (آمنہ مشفق) نے ایک وفا شعار بیوی کی طرح ہر مرحلے میں شوہر کا ساتھ دیا۔ وہ سرسید کالج برائے خواتین (کراچی) میں تاریخ کی پروفیسر رہ چکی ہیں۔ 'افکارِ عبدالحق' ان کی مشہور کتاب ہے۔ ہم سبھی اردو والے ان کے غم میں شریک ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ خواجہ صاحب کے باقی کاموں کی اشاعت میں ہماری مدد فرمائیں گی۔

مشفق خواجہ کو یہ شعر بہت پسند تھا ـ

اس سرا میں نہیں قیام بہت   زندگی مختصر ہے کام بہت

انھوں نے ۶۹ سال کی زندگی میں واقعی بہت کام کیے۔ وہ ادبیات کے عالم ہی نہیں، عالم بے بدل تھے۔

ع   اپنا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سے کہیں جسے

---

[1] اس کتاب کی پہلی اشاعت مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۹۱ء میں ۲۱۶ صفحات میں عمل میں آئی تھی۔ اس میں ۱۵ مضامین شامل ہیں۔ [عباس]

ڈاکٹر نور السعید اختر

خضرِ اُردو

ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد میں مورخہ ۱۷ر فروری ۲۰۰۵ء کو امریکا سے ممبئی پہنچا۔ ابھی میں نے پوری طرح ہوش بھی سنبھالے نہیں تھے کہ میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی اور ہمیشہ کی طرح میری چھٹی حس مجھے کسی اَنہونی کا احساس دلانے لگی۔ ان حالات میں میرا دل روحانی کرب سے بیٹھنے لگتا ہے۔ میں نے سوچا یا اللہ! سمندری ہیجان کو آئے ہوئے ابھی کتنے دن گزرے ہیں کہ اب کوئی اور سونامی کی آمد آمد ہے؟ آج تک میں نے اپنی چھٹی حس سے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ ۲۱ر فروری کو میری حالت زیادہ ہی غیر ہوگئی۔ ۲۲ر فروری کی صبح مجھے جناب محسن چشتی صاحب کا امریکا سے ای-میل موصول ہوا۔ جس میں میرے مربی، نگراں اور میرے خضرِ تحقیق جناب مشفق خواجہ کے ارتحال کی خبر تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے اردو ادب پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا ہو۔ اور اچانک اردو ادب، تحقیق، تنقید، صحافت، شاعری، مزاح نگاری، کالم نگاری، تبصرہ نویسی اور پیش لفظ نویسی کا ایک روشن مینار بے نور ہو گیا ہو۔ میں نے امریکا ہی میں کراچی جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس سے قبل بھی میں دو مرتبہ پاکستان جا چکا تھا اور دونوں مرتبہ میں نے خواجہ صاحب سے ملاقات کی سعادت حاصل کی تھی۔ ویسے بھی سال میں دو تین مرتبہ خواجہ صاحب سے ٹیلیفون پر گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔ وہ ریسیور اٹھا کر نہایت شیریں اور پُر تپاک لہجہ میں 'فرمایئے' کہا کرتے تھے۔ میں اس تکلم کی شیرینی سے اپنا مدعا بھول جایا کرتا تھا۔ ویسے خواجہ صاحب سے بات کرتے ہوئے بھی خوف طاری رہتا تھا کہ کہیں زبان اور تلفظ کی غلطی نہ ہو جائے۔ افسوس کہ اب ایسا دلکش، دلآویز اور ہوش رُبا طرزِ تخاطب باقی نہیں رہا۔ مجھے تو ٹیلیفون کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خدشہ محسوس ہوتا ہے۔ میں اس لہجے کی حدوت کو ٹیلیفون ریسیور ہی میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں لیکن ایسا کب ہوتا ہے؟ البتہ میرے ساتھ یہ واقعہ ضرور ہوا کہ خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد سے آج تک مجھ میں لکھنے پڑھنے کی سکت باقی نہیں تھی۔ میں جب بھی کسی تحقیقی مقالے کو قلمبند کرتا تو خواجہ صاحب کا جاذبِ نظر چہرہ مسکرا مسکرا کر ہمہ وقت میری ہمت افزائی کرتا اور میری تمام کوتاہیوں کی نشاندہی کرتا چلا جاتا اور جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آتی، کسی کتاب سے کوئی حوالہ یا کوئی کتاب درکار ہوتی تو میں خواجہ صاحب سے رجوع ہوتا۔ خواجہ صاحب میری مشکل کشائی میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ میرے ایک سوال کے جواب میں بیسیوں ایسی باتیں بتا دیتے جو درجنوں کتابوں کو چاٹ جانے کے بعد بھی بہ مشکل حاصل ہو سکتی تھیں۔ وہ تو بحر العلم تھے، ایک انسائکلو پیڈیا تھے اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ میرے ناقص قلم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میں خواجہ صاحب کے علم و ادب کے ذخیرے

کا احاطہ کر سکوں البتہ ایک ذاتی واقعہ ضرور کہتا چلوں گا جس میں خواجہ صاحب کی بندہ نوازی کے علاوہ محقق نوازی کا ثبوت موجود ہے۔

آج سے دو برس قبل میں کراچی میں اپنی بہن کے یہاں مقیم تھا۔ میں پاکستان سفر کے لیے کم لیکن اپنے تین مقاصد کو پورا کرنے کی غرض جایا کرتا تھا۔ سب سے پہلے اپنی عزیز بہن بیگم علی گوہر سے ملنے کا مشتاق رہتا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب سے بالمشافہ ملاقات کا متمنی اور ان کی نشاندہی پر مرحوم مولوی عبدالحق بابائے اردو کے ذخیرۂ مخطوطات کی خاک چھانتا ہوتا۔ میں نے بڑی تگ و دو کے بعد ۔۔ اہم مخطوطات کے زیراکس بھی حاصل کر لیے تھے۔ اس مرتبہ میں صرف خواجہ صاحب سے نیاز حاصل کرنے اور اُن سے چند تحقیقی گتھیاں سلجھانے کی خاطر کراچی گیا تھا۔ میں نے کراچی پہنچتے ہی خواجہ صاحب کو فون کیا۔ خواجہ صاحب نے دوسرے دن صبح دس بجے مجھے اپنے مکان پر (ناظم آباد) مدعو کیا۔ میں اپنے ڈرائیور کے ہمراہ خواجہ صاحب کے مکان پر پہنچا۔ سہ منزلہ عمارت کے درمیانی حصہ میں خواجہ صاحب ہمہ تن میرے منتظر تھے۔ ڈرائیور بھی میرے ساتھ تھا۔ خواجہ صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ میرے ساتھ ڈرائیور کو بھی صوفے پر بیٹھنے کی تاکید کی۔ میں بیک نظر خواجہ صاحب کے خلوص، بے پناہ محبت اور انسان دوستی کا قائل ہو گیا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ خیریت و عافیت کے بعد میں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں اپنی کتابیں پیش کیں۔ خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ کتابیں اُن کے لیے نایاب تحفہ ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے میری کتابوں کو سامنے والی میز پر رکھا۔ میں نے دیکھا وہ تمام کتابیں خواجہ صاحب کے میز پر پہلے ہی سے بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ بھلا ایسا کب ممکن تھا کہ اردو کی کوئی کتاب شائع ہو اور وہ خواجہ صاحب کی دسترس سے باہر رہے۔ خواجہ صاحب کے پرستار اور جاسوس نما احباب دنیا کے ہر کونے میں انھیں شائع شدہ کتابوں کے پارسل بھیج کر اُن کی دعاؤں کے طالب رہتے ہیں۔ میں نے اپنی کتابوں کو منتشر دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اب خیر نہیں۔ ہر کتاب کے پوسٹ مارٹم کے بعد خواجہ صاحب مجھے ضرور آڑے ہاتھوں لیں گے۔ خواجہ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کو بھی بخشتے نہیں تھے۔ زبان و بیان کی غلطیوں پر وہ اپنی خفگی کا اظہار بڑی شد و مد سے کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی نہیں بخشا اور بڑے پیار سے میری ہمت افزائی کرتے ہوئے مجھے چند مفید مشورے دیے۔ میری کتابوں میں دکنی کے ایک مشہور و معروف شاعر کی مثنوی بھی تھی۔ خواجہ صاحب اسے دیکھ کر خوش ہوئے، اس کی خوبیوں اور کوتاہیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اُن کی نظر میں اس مثنوی کا ایک اور مخطوطہ ہے جو کلکتہ کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ میں نے قطع کلامی سے معافی چاہتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا کہ 'خواجہ صاحب، اس مثنوی کے آج تک صرف دو نسخے محققین کی دانست میں ہیں جن کی مطابقت کے بعد میں نے یہ مثنوی مرتب کی ہے'۔ خواجہ صاحب کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ انھوں نے فرمایا' آپ بجا فرماتے ہیں، کلکتہ کے کتب خانے کی دست نوشتہ فہرست میں اس مثنوی کا نام

درج ہے لیکن مصنف اور سنہ کتابت ندارد ہے۔ یہ غالباً ٹیپو سلطان کے کتب خانے کا نسخہ ہے جس میں تصاویر بھی ہیں۔ خواجہ صاحب نے ہدایتاً کہا کہ میں اس قدیم ترین قلمی نسخہ سے مطابقت کے بعد اس مثنوی کا متن از سرِ نو تیار کروں۔

میں نے ہندوستان لوٹ کر پہلی فرصت میں کلکتہ سے اس مثنوی کی فوٹو کاپی حاصل کی اور خواجہ صاحب کے حافظے اور یادداشت کا مزید قائل ہوگیا۔ یہ واقعی میری مرتبہ مثنوی کا قدیم ترین قلمی نسخہ ثابت ہوا۔ افسوس کہ اس کی تصاویر غائب تھیں۔ ذرا سوچیے کہ خواجہ صاحب کی عقابی نظریں کہاں کہاں نہیں تھیں اور انھیں تیر بہ ہدف کتابیں اور قلمی نسخے کیسے یاد رہتے تھے۔ میں نے خواجہ صاحب سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور نہایت احتیاط کے ساتھ تحقیقی مسایل پر خواجہ صاحب سے استفسارات کیے۔ خواجہ صاحب زبانی جوابات کے ساتھ، تذکروں اور متعدد کتابوں سے داخلی حوالے دکھاتے چلے جاتے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا حافظہ کس بلا کا ہے۔ خواجہ صاحب کے مکان کی ہر منزل کتابوں سے لبریز تھی۔ جس کمرے میں وہ مہمانوں سے ملا کرتے تھے اس کمرے کی چاروں دیواروں کی چھت تک کتابیں لدی ہوئی تھیں۔ ایک طرف اردو ادب کی تاریخ، دوسری طرف تذکرے، ایک طرف نئی کتابیں سجی ہوئیں اور دوسری طرف زیرِ مطالعہ کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ انھیں اپنی مطلوبہ کتاب تک پہنچنے میں قطعی دقت نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک سیکنڈ کے لئے وہ اپنی انگشت شہادت ماتھے پر لگاتے اور دوسرے ہی لمحہ میں اُن کا ہاتھ نہ صرف اس کتاب تک پہنچ جاتا بلکہ وہ صفحہ بھی نکال لیتے جہاں وہ ضروری حوالہ موجود ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ بے جان کتابیں خواجہ صاحب کی خدمت میں سربہ سجود، دست بستہ، حکم کی تعمیل میں کھڑی رہتی ہیں۔

اس دوران وہ چائے اور بسکٹ سے تواضع کرتے اور بڑی اپنائیت کے ساتھ اہم مشوروں سے نوازتے۔ میری خوش قسمتی کہیے کہ خواجہ صاحب نے مجھے چند از حد نایاب مخطوطات کا دیدار کروایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان میں دیوانِ ولیؔ اورنگ آبادی کا قدیم ترین مخطوطہ شامل تھا۔ اس نسخہ کے اندر ایک کاغذ پر خواجہ صاحب کی یادداشتیں بھی درج تھیں۔ خواجہ صاحب نے مجھے تاکید کی کہ میں ولیؔ اورنگ آبادی کے شاگرد رشید محمد اشرفؔ گجراتی کا دیوان مرتب کروں۔ انھوں نے کہا تھا کہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں اشرفؔ گجراتی کا قلمی دیوان موجود ہے اور وہ اس کی فوٹو کاپی مجھے ضرور عنایت کریں گے۔ دوسرے دن شام کو خواجہ صاحب نے معذرت چاہی اور کہا کہ 'انجمن ترقی اردو' کراچی کا مخزونہ دیوانِ اشرفؔ نہایت بوسیدہ حالت میں ہے، اس کی فوٹو کاپی نہیں نکل سکتی البتہ میں جب چاہوں اس مخطوطے سے استفادہ کرسکتا ہوں۔ میں نے خواجہ صاحب کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہندوستان میں دیوانِ اشرفؔ کے مخطوطے تلاش کیے۔ انجمن ترقی اردو، دہلی کے کتب خانے میں مجھے دیوانِ اشرفؔ کے مخطوطے کا پتہ چلا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے اسے دیکھنے کی

اجازت دی اور ضروری صفحات کی فوٹو کاپی بھی عنایت کی۔ میری دانست میں یہ وہی مخطوطہ ہے جو معروف محقق قاضی اختر میاں جوناگڑھی کو مرحوم ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی کے کتب خانے سے حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اپنی کتاب 'مضامینِ مدنی' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بہر کیف قاضی اختر میاں جوناگڑھی نے دیوانِ اشرف پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جو حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے دیوانِ اشرف کے دہلی والے نسخے کی اچھی طرح چھان پھٹک کی اور 'ولی اورنگ آبادی کا ایک تلمیذ رشید' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا۔ میں نے اس کی ایک کاپی خواجہ صاحب کو ارسال کی۔ خواجہ صاحب نے میری ہمت افزائی کی اور از سر نو دیوانِ اشرف گجراتی کو مرتب کرنے کی تلقین کی۔ میں نے خواجہ صاحب کی حسبِ خواہش دستیاب شدہ نئے مخطوطے کے تناظر میں دوبارہ دکنی مثنوی کا تقابلی متن تیار کر لیا تھا۔ دیوانِ اشرف کو مرتب کرنے کے لیے ضروری نوٹس اور فوٹو کاپیاں حاصل کر لی تھیں اور اس اثاثے کے ساتھ خواجہ صاحب کے در دولت پر دستک کے لیے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ خواجہ صاحب میری دسترس سے بہت دور چلے گئے۔ اب اگر یہ مخطوطے شرمندۂ اشاعت بھی ہو جائیں گے تو وہ کس کسوٹی پر پرکھے جائیں گے۔ میری تحقیق کی رعنائی سب خواجہ صاحب کے تصور سے وابستہ تھی۔ بقول غالبؔ ۔

تھی وہ اِک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

ہم سب کے لیے خواجہ صاحب ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ مشفق بھی تھے اور خواجہ بھی۔ لہٰذا بندہ نوازی ان کی فطرت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ نہایت خلیق، شفیق، مہربان اور معارف پرور شخصیت کے مالک تھے۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور تحقیق اُن کا مشغلہ۔ ان کا دولت کدہ اردو و فارسی کے پروانوں کے لیے کھل جا سم سم سے کم نہیں تھا۔ صبح سویرے ریسرچ اسکالر ان کے یہاں آ دھمکتے اور توقع سے زیادہ تحقیقی مواد حاصل کرنے میں کامیاب رہتے۔ میں جب تک خواجہ صاحب کے یہاں بیٹھا رہا، دو چار حضرات نے نایاب کتابوں سے ضروری حوالے پا لیے تھے جو انھیں کہیں اور دستیاب نہیں تھے۔ خواجہ صاحب باتوں باتوں میں ان حضرات کی نشاندہی کرتے جاتے اور مہمان کی دلجوئی میں مصروف رہتے۔ ہماری گفتگو کے اختتام سے قبل خواجہ صاحب نے اپنی الماری سے کیمرہ نکالا۔ پہلے خود ہماری تصاویر اُتاریں اور بعد میں ہمارے ساتھ اپنی تصویر کھنچوائی۔ خواجہ صاحب نے اس ناچیز کو چند البم دکھائے جن میں اردو، فارسی اور دیگر زبانوں کے جید عالموں اور اہم شخصیتوں کی نادر تصاویر تھیں۔ خواجہ صاحب کو فوٹو گرافی کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ اُن کی الماری میں متعدد کیمرے رکھے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر خواجہ صاحب کی ان تصاویر کو شائع کر دیا جائے تو اردو ادب کی عکسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

مرحوم خواجہ صاحب کا اصل نام 'عبدالحیٔ' تھا۔ وہ ۱۹ اردسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب، ماہر اقبالیات و اسلامیات، خواجہ عبدالوحید کے فرزند ارجمند تھے۔ گزشتہ چند سالوں سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ بالآخر ان کے گردوں نے کام کرنا بند کردیا اور یہی مرض اُن کی موت کا بہانہ ثابت ہوا۔ خواجہ صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ پس ماندگان میں صرف اُن کی بیوہ آمنہ مشفق کے علاوہ نایاب کتابوں کا ذخیرہ، مشاہیر کے ڈھیر سارے خطوط اور زبان و ادب کی اہم شخصیات کی یادگار تصاویر کے البم ہیں۔

خواجہ صاحب کو اردو ادب کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار جناب یوسف ناظم سے بے حد انسیت تھی۔ انھوں نے میرے ہمراہ ان کے لیے چند کتابیں، دعائیہ کلمات کے ساتھ ارسال کی تھیں۔ جناب یوسف ناظم صاحب نے خواجہ صاحب کے انتقال پر روزنامہ 'انقلاب' کو انٹرویو دیا تھا۔ اس میں یوسف ناظم صاحب نے خواجہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ'

> 'مشفق خواجہ صاحب بنیادی طور پر ایک محقق تھے مگر اُن کی عمومی شہرت ایک کالم نگار کی حیثیت سے تھی جو وہ خامہ بگوش کے نام سے پاکستان کے ایک مشہور جریدے 'تکبیر' میں لکھتے تھے۔ وہ کالم اتنا مقبول تھا کہ اسے ہندوستان میں 'کتاب نما' دہلی میں شائع کیا جانے لگا۔ اس کالم کی تعداد دو ہزار سے زاید ہے'۔

خواجہ صاحب کی طنزیہ نگاری کی جملہ خصوصیات کو یوسف ناظم صاحب نے ایک جملہ میں سمیٹ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ' خامہ بگوش کے حوالے سے خواجہ صاحب کی شخصیت ایک طنز نگار کے طور پر نمایاں ہوئی اور سچ یہ ہے کہ ان کے قلم کی کاٹ مشتاق یوسفی سے آگے نکل جاتی تھی'۔

اردو کے نابغۂ روزگار مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے خواجہ صاحب کا ناقابل فراموش خاکہ لکھا ہے۔ ناظرین کی خدمت میں اس خاکے سے ایک اقتباس پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ خواجہ صاحب کے چلے جانے سے اردو ادب میں کس قدر وسیع اور عمیق خلا پیدا ہوا ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب لکھتے ہیں:

> 'مشفق خواجہ محقق ہیں، شاعر ہیں، نقاد ہیں، صحافی ہیں، کالم نگار ہیں، مزاح نگار ہیں، بس اتنا تعارف کافی ہے۔ ہونے کو تو وہ اور بھی بہت کچھ ہیں مگر میں انھیں مزاح نگاری پر ہی روکنا چاہتا ہوں اور انھیں رُکنا بھی چاہیے۔ انھیں دیکھ کر وہ مصرعہ یاد آتا ہے۔

'کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں'

خواجہ صاحب کی تصانیف کئی ہیں، حال ہی میں ان کی دو کتابیں 'سخن در سخن' اور 'گفتنی ناگفتنی' (خامہ بگوش کی تحریروں کا انتخاب) مرتبہ مظفر علی سید منظرِ عام پر آئی ہیں۔

ناظرین کی خدمت میں خواجہ صاحب کا ایک خط پیش کیا جا رہا ہے جس میں اُن کی ادب، ادیب اور محقق نوازی کا بیّن ثبوت موجود ہے۔

○

III D-9/26
Nazimabad
Karanchi–74600

محترمی و مکرمی، سلام مسنون!

آپ کے لیے مندرجہ ذیل تین کتابیں بھیج رہا ہوں۔

۱۔ مرزا غازی بیگ ترخان، از: پیر حسام الدین راشدی

۲۔ تحقیقی نقوش، شفقت رضوی

۳۔ سراج اورنگ آبادی 〃

پہلی کتاب تو اُسی وقت سے رکھی ہے جب آپ کے ایک عزیز امریکہ جانے سے پہلے آئے تھے اور وزنی ہونے کی وجہ سے یہ کتاب وہ ساتھ نہ لے جا سکے تھے۔ تیسری کتاب کے حاصل کرنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ اس کا کوئی نسخہ ناشر کے پاس تھا نہ مصنف کے پاس۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ وہ پرانی کتابوں کی دکانوں پر تلاش کریں۔ حسنِ اتفاق سے یہ نسخہ مل گیا۔

آپ کو جب بھی کسی کتاب کی ضرورت ہو بلا تکلف لکھیے۔ آپ کی ضرورت پوری کر کے مجھے دلی مسرت ہوگی۔

آپ کی ہمشیرہ محترمہ ان کتابوں کی قیمت پر اصرار کر رہی تھیں۔ ان کو بتا دیجیے کہ ان کتابوں کی یہی قیمت کافی ہے کہ یہ آپ کی نظر سے گزر جائیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۰۰۳/۳/۲۶ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر نور السعید
ممبئی

شیخ محمد علی

میرے مشفق خواجہ

(خامہ بگوش کے قلمی نام سے علم و ادب کی دنیا میں معروف مشفق خواجہ کے یوم وفات پر ایک تاثراتی تحریر)

ان معاشروں کے علمی و تہذیبی اعتبار سے ترقی یافتہ و بالغ نظر ہونے میں کوئی شک ہی نہیں جہاں عالموں کی کثرت ہو اور جو اکتساب و جستجو کے سمندر سے خود کو بھی فیضیاب کرتے ہوں اور دوسروں کو بھی۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اول تو ہمارے یہاں حقیقی معنی میں عالموں کا کال ہے اور اگر ہیں بھی تو مزاجاً انھوں نے اپنے آپ کو عالم و دانشور سمجھ لیا ہے اور اکتساب و جستجو کے عمل سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے خود کو ان سے دور رکھا ہے جنھیں ان کی اصل ضرورت تھی اور ہے۔

لفظوں کے استعمال اور فصاحت و بلاغت کا دریا بہا کر غالباً مذکورہ لوگ دوسروں پر تو یہ تاثر قائم کر لیتے ہوں کہ وہ کیسے بلند پایہ عالم ہیں لیکن جس فصل کو ان سے سیراب ہو کر سرسبز و بالیدہ ہونا تھا وہ ناپید ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہی چیز ان کی علمیت اور دانشوری کی چغلی کھا رہی ہے۔ امام غزالیؒ نے کہیں یہ بیان کیا تھا کہ ہر نئی کتاب، نئی تحریر، نیا خیال اور نیا ادراک مجھ پر اپنے علم کی کمی اور جہل کی فراوانی کو واضح کرتا ہے لیکن ہمارے عالم، دانشور اور محقق امام صاحبؒ کی اس سچائی سے نہیں۔ محض چند ڈگریاں حاصل کر کے، کچھ کتابیں لکھ کر اور کچھ عزت بٹور کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم و دانش کا پیالہ انھوں نے بھر لیا ہے اور وہ لوگ ماوتم بن چکے ہیں۔

خود فریبی و کج فہمی کے اس رویے نے انھیں عام سے 'خاص' بنا ڈالا ہے اور اسی خاص ہونے کے یقین نے ان کی طبیعتوں میں اکھڑپن، تلخی اور کڑواہٹ بھر دی ہے۔ ان کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل، لہجے میں خشکی اور درشتی اور جسم میں خاص وضع قطع کا تناؤ ان کے خود پسند مغرور ہونے کی واضح علامت بن کر رہ گیا ہے۔ یہ نمایاں طور پر اس قدر بلند و ارفع مقام پر چڑھے بیٹھے ہیں کہ کسی عام کی رسائی ان تک آسان نہیں۔ اس ماورائے بشر مزاج نے انہیں، ورائے بشر مخلوق بھی بنا چھوڑا ہے۔ یہ سب کچھ بدقسمتی سے علم و شہرت کے نام پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔

جہاں علم کی کاری گری اور شہرت کا مزاج یہ ہو، وہاں قحط الرجال کا جنم لینا فطری ہے۔ مجھے ہمیشہ حیرت رہی ہے کہ قحط الرجال کے اس بدترین دور میں مشفق خواجہ مرحوم جیسے لوگ بھی اپنا وجود رکھتے تھے اور سراپا امام غزالیؒ کے اسی قول کا احاطہ کرتے تھے جسے میں نے اپنے لفظوں میں اوپر نقل کیا ہے۔ اگر وہ واقعی علم و شہرت

کے موجودہ سحر کا شکار ہوتے تو ان کی ذات بھی اسی خود پسندی، بڑائی، نخوت، انا اور رعونت کا پرتو ہوتی جس کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ عجز و انکسار، شفقت و محبت اور اخلاق و مروت جیسے ان پر ختم تھی۔ ان کی ذات میں تو حافظ و سعدی اور رومی دکھائی دیتے تھے۔

خواجہ صاحب مرحوم نے اپنے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی تکمیل کے لئے بلاشبہ گوشہ نشینی اختیار کی ہوئی تھی لیکن وہ مردم بیزار، قنوطی اور تنہائی پسند قطعاً نہ تھے۔ ان کی ذات سے تعلق و محبت کی ایک ایسی خوشبو پھوٹتی تھی کہ ہر کس سحر زدہ ان کی طرف کھینچا چلا آتا تھا۔ وہ جو قلم کے کھلاڑی تھے وہ بھی اور جو شخص ادب کے قاری و دل دادہ تھے وہ بھی۔ اردو زبان سے آگہی رکھنے والا ہر شخص بالعموم اور تنقید و ادب سے وابستہ ہر فرد بالخصوص ان کا نام جس محبت و سرشاری سے لیتا تھا اس کا مشاہدہ کسی دوسری ذات کے حوالے سے میں نے نہیں کیا۔ یاد رکھیے محبت کروائی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے اور جن سے یہ ہوتی ہے ان کی صفات، ان کے رویے اور ان کا مزاج کسی کے اندر اس کی جوت جگاتا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے خواجہ صاحب مرحوم سے محبت کی ہے اور آج تک کر رہے ہیں، انہیں ان کی اعلیٰ ظرفی، منکسر المزاجی، عجز و انکسار اور کسی کے لیے کچھ کر گزرنے کے وصف کے باعث محبت تھی اور یہی وہ وصف ہے جو آج ناپید ہے بالخصوص اس طبقہ میں جسے ہم اہل علم و دانش کہہ رہے ہیں۔

خواجہ صاحب مرحوم کس پائے کے محقق، دانشور، ادیب، شاعر اور نقاد تھے، اس پر میرے لیے کچھ عرض کرنا چھوٹا منھ بڑی بات کے مترادف ہے لیکن بہر حال یہ بات اصولی طور پر طے ہے کہ جس میدان کے وہ آدمی تھے اس میدان میں ان کی جیسی صفات اور قابلیت رکھنے والا شخص دور دور کوئی نہیں۔ ان کے ہاں سجنے والی محفلوں میں جا کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ حقیقی بڑائی اور بلندی کے معیار کیا ہیں اور اخلاق و رواداری اور شفقت و محبت کیا ہے۔ ان کے لیے ہر عام آدمی خاص ہوا کرتا تھا اور اسے وہ یوں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے جیسے وہ کوئی خاص اور اہم شخص ہو۔ خود میری مثال لے لیجیے شہرت، مقبولیت اور علم و فکر کے حوالے سے میں کسی ایسے درجے اور منصب پر فائز نہیں جس سے ملنے کی کوئی تمنا کر سکے اور مل کر اپنے عزت و بڑائی اور تفاخر کے احساس کو جگا سکے۔ لیکن ہمیشہ انھوں نے مجھ جیسے گمنام، غیر معروف اور علمی و فکری اعتبار سے صفر شخص پر اپنی محبتوں اور شفقتوں کی بارش برسائی یہی ان کی بڑائی اور معرفت کی نشانی ہے۔

میرے اور خواجہ صاحب کے درمیان محبتوں اور شفقتوں کے رشتے جوڑنے میں میری تحقیقی و باحجم تصنیف 'نظریات و افکار اقبال' نے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ورنہ اس سے قبل میرا وجود مرحوم کے لیے خارج کی حیثیت رکھتا تھا۔ بھلا کہاں مجھ جیسا گمنام و غیر معروف لکھنے والا اور کہاں خواجہ صاحب جیسا دیو قامت و ہیرا صفت انسان۔ کئی سال قبل نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شایع ہونے والی اس کتاب کو صدارتی ایوارڈ کے لیے داخل دفتر کیا گیا اور جن ماہرین کے سامنے سفارش و رائے کی خاطر پیش کیا گیا ان میں مرحوم سرِ فہرست

تھے۔ بقول ان کے انھوں نے دوسری کتابوں کے مقابلے میں اس کے لیے ایوارڈ کی سفارش کی اور اس پر اپنی مضبوط و پختہ رائے بھی متعلقہ کمیٹی کو ارسال کردی۔ ایوارڈ کا نتیجہ تو وہ نہ تھا جو مرحوم چاہتے تھے، تاہم سرکاری اعلان کے کچھ عرصے بعد پہلی دفعہ انھوں نے مجھے فون کیا اور نہایت شستہ و خوبصورت آواز کے ساتھ مجھ سے ملنے خواہش ظاہر فرمائی۔

بلاشبہ وہ پہلا فون اور ان کی وہ آواز میں کبھی فراموش نہ کرپاؤں گا۔ وہ شخص جسے زبان و کلام کے تناظر میں دنیا ایک بڑے ادیب و دانشور، محقق و شاعر اور نقاد کی حیثیت سے جانتی تھی، وہ مجھ سے ہم کلام بھی تھی اور نیاز مند بھی۔ خواجہ صاحب سے میرا تعلق کیا تھا؟ انہوں نے میری کتاب پر ایوارڈ دینے کی سفارش کیوں کی تھی؟ وہ مجھے خود فون کیوں کررہے تھے، ذرا ان سب باتوں کا تجزیہ فرمایئے اور پھر اندازہ کیجیے کہ حقیقی اہل علم و دانش کون ہوتے ہیں اور قحط الرجال کے اس دور میں ان کا مقام و منصب کیا ہوتا ہے۔ میرے لیے تو یہی سب سے بڑا اعزاز تھا کہ مجھے نہ جانتے ہوئے بھی انھوں نے اس کتاب پر اپنی مثبت و اعلیٰ رائے دی اور اس سیاق و سباق میں مجھ جیسے گمنام کو فون بھی کر ڈالا۔

علم و دانش کے کسی پیکر کا یہ روپ بھی ہوسکتا ہے، یہ بات پہلی دفعہ مجھ پر منکشف ہوئی تھی۔ مجھے تو اہل علم کے رویوں اور ان کی نخوتوں نے 'عالم بیزار' بنا چھوڑا تھا۔ اب اندازہ یہ ہوا کہ واقعی ذی علم لوگ کون ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں۔ عمر میں ان سے میں بہت چھوٹا تھا اور وہ مجھے اس کتاب کے تناظر میں کوئی عمر رسیدہ شخص سمجھے بیٹھے تھے لیکن باوجود اس کے ان کا رویہ، ان کا مزاج اور طبیعت انتہا درجے کی مشفقانہ رہی اور وہ میری کتاب پر رطب اللسان رہے۔ میری محنت و کوشش کو سراہتے رہے اور اس کی نت نئی جہتوں پر سے پردے اٹھاتے رہے۔

کوئی اور اگر کتاب کے موضوع اور اس کے حجم کو دیکھ کر بلا بھی بیٹھتا تو عمر کا اندازہ کر کے سخت و خشک اور کھر ذرا ہو رہتا کیونکہ مجھے ایسا تجربہ بھی رہا ہے لیکن وہ نام کے ہی مشفق نہ رہے، مجسم مشفق بنے رہے، یہی ان کی عظمت و بڑائی تھی۔ اس نشست میں انھوں نے ان ذمہ داروں کا انکشاف بھی کیا جو جاہ و دنیا پرستی کے باعث اس کتاب پر ایوارڈ کی راہ میں آڑے آئے اور ایک نامور ہستی کے حق میں اپنی رائے کا استعمال کر بیٹھے۔

خواجہ صاحب مرحوم کا یہ قرب، یہ لطف و کرم، یہ محبت اور یہ شفقت میرے لیے ہر ایوارڈ سے بڑھ کر تھی۔ مجھے نہ تو اس وقت کسی صدارتی ایوارڈ کی تمنا تھی اور نہ ہی اس دل پذیر ملاقات کے بعد کوئی تمنا رہی۔ ذرا تصور فرمایئے مشفق خواجہ جیسی دیو قامت شخصیت کسی تحقیق یا تخلیق کو یوں عزت بخش دے تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی اعزاز ہوسکتا ہے؟ کبھی نہیں! میں ساری زندگی لفظوں کی اس مٹھاس اور چاشنی کو محسوس کرتا رہوں گا جو وقت کے ایک حقیقی عالم و دانشور اور محقق نے میری محنت، تخلیق اور تحقیق پر ادا کیے ہیں۔ یہی سب کچھ میرا سرمایہ اور

میری دولت رہے گا، اس کے سوا کچھ نہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک گمنام، غیر معروف اور گوشہ نشیں جیسے لکھنے والے کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز اور کیا ہو سکتا تھا اور ہو سکتا ہے۔

یہ ملاقات پہلی اور آخری نہ رہی بلکہ اس کے بعد خود خواجہ صاحب نے وہ عزت و حوصلہ عطا فرمایا کہ ملاقاتوں کے در کھلتے چلے گئے۔ پندرہ بیس سال بیرونِ ملک بھی آمد و رفت رہی لیکن اس آمد و رفت میں بھی ان کی شفقتوں سے محروم نہ رہا۔ کبھی میں فون کرتا تو 'فرمائیے' جیسا سحر انگیز لفظ میرے وجود کو جکڑ لیا کرتا اور کبھی ان کا فون ملاقات کی سبیل پیدا کر دیا کرتا۔

ہمیشہ ایک بڑے بھائی کی طرح میرے مسائل سے آگہی کی کوشش کرتے رہے۔ میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور لفظوں سے اندر کی کیفیت کا ادراک کرتے رہے اور نہایت مربیانہ و مشفقانہ انداز میں رہنمائی و معاونت فرماتے رہے۔ حیران ہوتا ہوں کہ اس دنیا میں جہاں لوگ حقدار سے حق چھین کر اپنوں اور اپنے چاہنے والوں کے حوالے کرتے ہیں وہاں خواجہ صاحب جیسے لوگ بھی بسا کرتے تھے جو ڈھونڈ ڈھونڈ کر حقدار کا حق اس تک پہنچایا کرتے ہوں۔ یہ بات کم لکھنے کو زیادہ سمجھنے والی ہے اور اپنے تناظر میں اوپر جو کچھ بھی عرض کیا ہے اس کے سیاق و سباق میں دیکھی جانے والی ہے۔

پبلک ریلیشننگ (Public Relationing) جسے عرفِ عام میں پی-آر کہا جاتا ہے، کے دور میں جہاں لوگ 110 گرام کاغذ پر بمشکل تمام دس گرام وزنی کوئی بات لکھ پاتے ہیں اور اسی پر شہرت، عزت اور تمغے حاصل کر لیتے ہیں، وہاں اصل کو تلاش کر کے آنکھوں پر بٹھانا صرف خواجہ صاحب مرحوم کا ہی کام تھا۔ حق کہنا، حق لکھنا اور حقدار کو حق دلانے کے لیے کچھ کر گزرنا شاید اب یہ کام کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

جب بھی میں اپنی کوئی کتاب ان کی خدمت میں پیش کرتا تو فوراً کھول کر پہلے اس پر دستخط ثبت کرا لیتے۔ شرمندگی و ندامت سے انکار بھی کرتا اور یہ احساس دلانے کی کوشش بھی کہ بہت کم علم و بے حیثیت ہوں نہ مانتے، عزت افزائی اور پذیرائی کے بول بول کر دستخط کروا ہی چھوڑتے۔ آج سوچتا ہوں کہ گمنامی اور اندھیرے میں پڑے ہوئے مجھ جیسے شخص کے لیے جسے لکھنے پڑھنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا، ان کی ذات کس قدر اہم تھی۔

بات لکھنے پڑھنے کی ہو یا تحریر و تحقیق کی یا پھر کسی مشکل و پریشانی اور اذیت کی، اس کا ہر پہلو خواجہ صاحب کو کچھ کر گزرنے پر مائل کیا کرتا تھا۔ میرے ہر مسئلے، ہر پریشانی اور ہر مشکل کو انھوں نے بھانپا، بات کو اندر سے نکلوا کر اس کے درست اور بہتر حل کی طرف راہنمائی کی اور میرے حوصلے کو اپنی شفقتوں اور محبتوں سے کمک پہنچاتے رہے۔ کرنل محمد خاں مرحوم کی کتاب 'بجنگ آمد' کے حقوق اشاعت دس سال کے لیے جب میرے ادارے نے حاصل کیے تو پنجاب میں اس کے پرانے پبلشر کو جیسے جلال آ گیا اور اس نے دھڑلے اور ہٹ دھرمی کے ساتھ دبا کر اس کی پائریسی شروع کر دی اور وہ کتاب جو مارکیٹ سے تقریباً ناپید تھی، دیکھتے ہی

دیکھتے ہر جانب دکھائی دینے لگی۔ قانونی موشگافیوں نے جنم لیا۔ مختلف پیچیدگیاں اور مسائل نمودار ہوئے، مقدمات کی تیاریاں زور پکڑ گئیں اور کرنل صاحب (اللہ مغفرت فرمائے) از خود مختلف دباؤ میں عضو معطل بن بیٹھے۔

ان کے عضو معطل بن جانے سے بعض غیر متعلق افراد کو بھی تقویت ملی اور وہ بھی پھڈے میں ٹانگ اڑانے لگے۔ 'جنگ آمد' کی اس جنگ نے جو ناشر و مصنف کے درمیان قلمی تھی یا بہت سے بہت قانونی، اس وقت ایک نیا رُخ اختیار کرلیا جب اس میں کراچی کے ایک عالم دین بھی آکودے اور سخت لب و لہجے کے ساتھ کچھ کرگزرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ مارکیٹ میں کمیابی کے باعث اس کتاب کی بڑی تعداد میں اشاعت اور پھر مارکیٹنگ سے پہلے ہی اس کی بڑے پیمانے پر پائریسی اور بعدۂ ہویدا ہونے والے ان بدترین حالات نے مجھ پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہ کیے۔ ایسے دل گرفتہ، مایوس کن اور نازک وقت میں اللہ مغفرت فرمائے، خواجہ صاحب ہی نے آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالا اور کچھ اہم فیصلے کر کے مجھے ایک مستقل جنجال سے نکال باہر کیا۔

زندگی کے ذاتی مسائل ہوں یا اشاعتی دھندے کی پریشانیاں، ہر مرحلے پر مجھے ان کی مشفقانہ و برادرانہ مشاورت و معاونت میسر رہی ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے، علمی اعتبار سے بھی اور دیگر حوالوں سے بھی۔ مشہور بھی تھے اور بہت معروف بھی لیکن انھوں نے کبھی کوئی ایسا تاثر مجھ پر نہیں چھوڑا کہ میرا وجود میرے فون اور میری ملاقاتیں انھیں ناگوار گزر رہی ہوں۔ وہ جب بھی ملے نہایت محبت سے اور نہایت شفقت سے۔ سوچتا ہوں اگر یہ خصوصیات علم کے ساتھ مختص ہیں تو دوسرے صاحب علم و دانش کیوں اس سے محروم ہیں اور کیوں عامۃ الناس کو اپنے سے جدا اور الگ رکھے ہوئے ہیں؟

خواجہ صاحب اپنی ذاتی حیثیت اور استعداد میں جس کے ساتھ جو کچھ ممکن ہوتا، کرگزرتے تھے۔ لگتا ہے کہ خدا نے بعض گھرانوں اور افراد کے لیے انھیں فرشتہ بنا چھوڑا تھا۔ سوچتا ہوں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو جن گھرانوں کا ذکر میں کر رہا ہوں یہ دنیا ان کے لیے قیامت سے کم نہ ہوتی۔ آج مجھے ان گھرانوں کی عزت نفس کا پاس ہے ورنہ میں ضرور عرض کرتا کہ اہلِ علم و دانش کے علمی کارنامے کتابوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اور کیا کچھ کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ حق مغفرت کرے اپنی ذات میں وہ کیا تھے، اس حقیقت کو آشکارہ کرنا کم از کم میرے قلم کے بس کی بات نہیں۔

خواجہ صاحب جس بلند مقام پر فائز تھے اور تحقیق و ادب کے حوالے سے جو کچھ بھی [illegible] نمایاں ان کی ذات سے وابستہ ہیں، اس پر قلم اٹھانا میری طاقت اور استعداد سے بڑھ کر ہے۔ وقت کا د[illegible]ن کی تحقیقات اور کارناموں کی حقیقت کھولتا رہے گا اور زمانہ بالخصوص اردو زبان سیراب ہوتی رہے گی۔ سچ صرف یہ ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں علمی کشف، درک اور تحقیق کے ذریعہ اگر کسی ذات نے اس عہد، دور اور وقت

کو کچھ دیا ہے تو وہ یقیناً مشفق خواجہ صاحب مرحوم کی ذات ہی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کی رحلت سے خلا پیدا ہو گیا ہے جو شاید کبھی پُر نہ ہو سکے۔ یقیناً مرنے والا اپنے پیچھے کسی نہ کسی کے لیے خلا چھوڑتا ہی ہوگا، انفرادی حیثیت میں کسی کی موت کسی کے لیے قیامت اور نا پُر ہونے والے خلا سے کم نہ ہوتی ہوگی لیکن ناپُر ہونے والے خلا سے متعلق جو جملے عموماً اجتماعیت کے تناظر میں استعمال ہوتے ہیں وہ سوائے لفظوں کی ہیرا پھیری کے کچھ نہیں۔ ہاں جن عالموں کی موت کو عالَم کی موت کہا جاتا ہے بلاشبہ خواجہ صاحب کی موت عالم اردو کے لیے ایسی ہی ہے۔ ان کے مرنے سے اس عالم میں جو خلا پیدا ہوا ہے یا جو قیامت برپا ہوئی ہے شاید صدیاں اس سے متاثر ہوتی رہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے بعد شاید ان جیسے کم ہی پیدا ہوں اور بڑھتے ہوئے قحط الرجال کا عذاب یہ قوم بھگتتی رہے گی۔

یہ قحط الرجال ہی تو ہے کہ اتنا بڑا شخص درمیان سے اُٹھ گیا اور محض مختصری خبروں کے کہیں کوئی نمایاں خبر دکھائی نہ دی۔ انتہا یہ کہ سرکاری ٹیلی ویژن سمیت کسی چینل کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنی خبروں میں اس اہم سانحہ کی خبر لگا دیتے اور کوئی تعزیتی پروگرام کر دیتے۔ گلیمر اور شوبز کی دیوانی اس دنیا میں سرکاری ٹی وی سے لے کر پرائیوٹ چینلوں تک کیا کچھ خرافات پیش نہیں کی جا رہی ہیں، یہ سب کے سامنے ہے۔ ناچ، گانا پر مبنی فواحشات پروگرام، لغو و بے معنی مباحثے گھنٹوں چلتے رہتے ہیں۔ ہر قسم کے ملکی و غیر ملکی گویوں، میراثیوں، ہواکاروں اور اداکاراؤں کی خبریں تڑکے کے ساتھ لگائی جاتی ہیں۔ وزراء و سفراء کی مصروفیات پر لایعنی گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ شوبز کے کسی بھی فرد کو چھینک بھی آجائے تو مسلسل خبریں چلتی رہتی ہیں۔ پاکستانی اداکارائیں ہندوستان میں کیا گل کھلا رہی ہیں، اس پر نیوز ریلیں لگتی ہیں۔ لیکن جن کے دم سے دنیا کا حقیقی رنگ آباد ہے، جو تہذیب و شائستگی اور علم کے جلوے سے معاشروں کی تطہیر اور تعمیر و ترقی کا فریضہ انجام دیتے ہیں وہ جہاں سے گزر بھی جاتے ہیں تو یہ ادارے چونک کر نہیں دیتے۔ یہ ادارے اور ان کے کرتا دھرتا سب حق ناشناس اور احسان فراموش ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ کسی کا حق کیا ہے اور قرض کیا ہے اور یہی اس ملک کا المیہ ہے۔

یہ دنیا تو یقیناً فانی ہے۔ وہ کون ہے جو آیا ہے، جائے گا نہیں۔ انبیاء و رسل بھی اپنا اپنا کام کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے ہیں۔ بس یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ مر کے بھی مرتے نہیں ہیں۔ میرے مشفق خواجہ ان ہی لوگوں میں سے ایک ہیں جو ہمیشہ اپنے کام اور اپنے کردار کے حوالے سے زندہ رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ۔ انشاء اللہ (اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے، آمین)۔

❁

رفیق ڈوگر

غمِ خواجہ

پاکستان میں اگر کسی شخص پر فنا فی الکتب کا الزام دیا جاسکتا ہے تو وہ ہیں مشفق خواجہ۔ ان کے گھر کے کل گیارہ کمرے ہیں۔ دس کمروں میں ان کا کتب خانہ مقیم ہے اور گیارہویں میں وہ میاں بیوی 'پناہ گیر' بنے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتب پر خرچ کرتے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کتابیں انھیں اس کمرے سے بھی نکال باہر کریں گی۔ بعض 'فاضل' خواتین وحضرات کتابیں ملنے ملانے والوں پر رعب ڈالنے کے لیے اکٹھی کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ کتابیں پڑھتے ہیں کہ ان کے مندرجات کے علاوہ حسب نسب سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ کون سی کتاب پہلے کہاں شایع ہوئی تھی، بعد کے ایڈیشن کب اور کہاں شایع ہوئے، کس میں کیا ترمیم واضافہ کیا گیا، کس مصنف نے کہاں کیا غلطی کی اور کیا چوری ڈاکہ ڈالا، انھیں سب علم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر اور یورپ تک کے اردو مصنفین ان سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ بڑے بڑے محقق اور مورخ ان کا پانی بھرنے کو بے تاب ملتے ہیں۔ خواجہ دن رات اس محفل کتب میں چہکتے مہکتے رہتے ہیں۔ بڑی سے بڑی سرکاری درباری تقریب میں نہیں جاتے، کوئی مشاعرہ اٹینڈ نہیں کرتے، کسی ادبی بے ادبی محفل کی رونق نہیں بڑھاتے۔ ان کی جملہ ادبی اور بے ادبی سرگرمیاں اس ایک کمرے تک محدود رہتی ہیں۔ لوگ بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کے لیے اپنی حلال کی کمائی خرچ کرتے ہیں۔ انھوں نے کتب کی دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھے ہیں جن کو وہ خود تربیت دیتے ہیں۔ جب وہ کالم لکھتے تھے تو دنیائے اردو کے پندرہ سولہ جرائد ان کا کالم شایع کرتے تھے۔ پھر اچانک وہ اس گناہ سے تائب ہوگئے۔ ہم نے کئی بار درخواست کی کہ لوٹ آئیں کہ آپ کو قاضی صاحب سے بھی زیادہ الحیاں اڑ یکدیاں نہیں مگر وہ اس گناہ کی وجہ سے اپنے علمی اور تحقیقی نقصان پر افسوس کرنا شروع کردیتے ہیں۔ انھوں نے پورے پانچ سال نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ قدیم مسودوں کے مطالعہ میں لگا دیے۔ اب کئی سال سے اس تحقیق کے موتیوں کو لڑیوں میں پرونے میں لگے ہیں اور بحرِ علم میں مزید موتی ڈھونڈنے کے لیے غوطے لگاتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کسی پر ایک فقرہ چست کردیں، ایک بار اپنے کیمرے کی آنکھ اس کی طرف موڑ دیں تو وہ زندگی بھر کے لیے ان کا ڈاکٹر تحسین فراقی بن جاتا ہے۔

علمی، تحقیقی، فوٹوگرافی اور فقرہ بازی کے میدانوں میں اگر کوئی ان کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ ان دونوں میں اتنی دوستی ہے کہ کراچی اور لاہور میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی صبح وشام کی

سرگرمیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ جب بھی خواجہ لاہور آئیں، ڈاکٹر صاحب ان کی دعوتوں کے بکنگ ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے پر ایسے ایسے فقرے داغتے ہیں کہ کسی غیر پر ضایع کریں تو زندگی بھر کا یارانہ ٹوٹ جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ خواجہ کی دوستی کی وجہ سے میں بھی آدھا کشمیری ہو گیا ہوں اور آدھا وحید قریشی کم از کم تین عدد کشمیریوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ اتفاق ہے یا حسن اتفاق کہ ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ کو ایوارڈ بھی ایک ہی سال ملے۔ خواجہ ڈاکٹر صاحب کی محفل میں انھیں سنا کر کہتے ہیں کہ 'اس سال سب نااہلوں کو ایوارڈ مل گیے ہیں' اور ڈاکٹر صاحب اس پر دفتر شگاف قہقہہ لگاتے ہیں۔

گزشتہ دنوں خواجہ لاہور آئے تو ڈاکٹر صاحب کے قہقہے عام ہو گیے۔ ان کے دفتر میں خواجہ کے پرستاروں کا ہجوم ہوتا۔ خواجہ سے خوفزدہ عالم فاضل لوگ بکنگ کی کھڑکی کے سامنے جمع رہتے۔ وہ کسی سے معذرت کرتے، کسی کو تسلی دیتے، کسی سے آئندہ دورہ لاہور کے وعدے دہراتے اور کسی کو ڈائری دکھا کر پوچھتے: 'ہے کوئی گنجائش؟' مگر جس کسی کو غم کھانے کی عادت پڑ جائے وہ اتنی مصروفیات اور پروانوں کی موجودگی میں بھی کوئی بہانہ غم ڈھونڈ لیتا ہے۔ خواجہ اپنے قیام لاہور کے دوران لاہور کے قدیم آثار اور تاریخی عمارتوں کے غم میں لگ گیے۔ فلاں تاریخی عمارت میں لوگوں نے گھر بنالیے ہیں، فلاں تاریخی مسجد میں نادر خطاطی برباد ہو گئی ہے، فلاں مقبرہ تباہ ہو رہا ہے۔ اس غم میں وہ لال پیلے ہو ہو جاتے تھے۔ اپنی کتب اور لائبریری کے مستقبل کے غم بھی بھول جاتے تھے۔ ہم کوئی بہانہ بناتے، اپنی حکومت کی مالی مشکلات بیان کرتے، سیاسی اور انتظامی مجبوریوں سے ان کے تیروں کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے اور وہ اردگرد کے ممالک سے دلایل ڈھونڈ لاتے۔ فلاں ملک میں تاریخی ورثہ کی حفاظت کے لیے یہ کچھ ہو رہا ہے، فلاں ملک والے یہ یہ کچھ کر رہے ہیں۔ تم لاہور والوں کے پاس کتنی بڑی تاریخی دولت ہے، تم اسے تباہ و برباد کر رہے ہو۔ تم لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے، حکام کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ ہم نے عرض کیا کہ عام لاہوری تو ایک طرف یہاں تو ہم گناہگاروں کی آخرت کی نجات کی بکنگ کرنے والے بھی جنت میں اپنے درجنوں شاندار محلوں کے باوجود ان آثار پر اپنی عارضی اور چند روزہ زندگی کے لیے محل ماڑیاں تعمیر کر رہے ہیں۔ انھیں روک کر اپنی دین دنیا کون برباد کرے گا۔ مگر وہ اتنے علم و فضل اور وسیع مطالعہ کے باوجود کوئی بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ اب آپ ہی بتائیں جب اتنا فنافی الکتب آدمی ہماری عرض داشت ماننے پر تیار نہیں ہوتا، ہماری مالی، قانونی اور سیاسی مجبوریاں نہیں سمجھتا تو فنافی الدنیا ہماری بات پر کب توجہ دیں گے۔ اہل لاہور، اہلِ دنیا اور اہل دین اپنے ورثہ کی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اہل علم ہماری سرکار کی مجبوریاں نہیں جانتے، اس کے باوجود ہم ایک بار پھر سب 'اہل' حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا نہیں تو وہ غم خواجہ کا ہی کچھ خیال کریں کہ بے غرض لوگوں کے بے غرض غم کا خیال کرنا اہل غرض کے اپنے مفاد میں ہوتا ہے۔

❁

مکتوباتِ خواجہ بنام سید حسن عباس

مشفق خواجہ (۱۹۳۵ - ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء) اردو کے نامور ادیب، محقق، ناقد، تبصرہ و کالم نگار اور سب سے بڑھ کر نہایت مخلص، وضع دار اور منکسر المزاج انسان تھے۔ علم اور انسان دوستی ان کی بہترین شناخت ہے۔ وہ کتابوں کے رسیا تھے۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی کے ذریعہ مجھ سے ان کی مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اُس وقت مَیں تہران میں تھا۔ انھیں شعرا کے تذکروں سے دل چسپی تھی۔ مجھے بھی پاکستانی مطبوعات کے مطالعہ کا شوق تھا۔ میں نے ایران میں شایع ہونے والے تذکرے ان کی خدمت میں بھیجے اور انھوں نے بھی اپنی اور دوسروں کی مطبوعات سے نوازا۔ سردست ان کے آٹھ خطوط یہاں پیش کیے جا رہے ہیں کچھ اور خط ادھر اُدھر ہو گیے ہیں انھیں بھی تلاش کر کے شایع کیا جائے گا۔ خواجہ صاحب کے خطوط ان کے صاحب طرز ہونے کے شاہد ہیں۔ وہ نہایت صاف و سلیس اور سادہ زبان میں اپنی باتیں روانی سے اور قلم برداشتہ لکھنے پر قادر تھے۔ انھوں نے کثرت سے خطوط بھی لکھے ہیں۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ لاہور سے شایع ہوا ہے۔ ایک دوسرا مجموعہ یہاں زیر اشاعت ہے۔ رسایل و جراید میں بھی ان کے خطوط چھپ رہے ہیں۔ اردو کے ایسے مخلص اور زبردست خدمتگار کی تحریریں اردو زبان و ادب کا سرمایہ ہیں جن میں نصف صدی سے زاید کے تجربات و مطالعات کا نچوڑ موجود ہے۔ لہٰذا ان کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اہل علم خواجہ صاحب کی کمی ہمیشہ محسوس کریں گے۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے۔

یہی تعبیر ہے خوابِ دلِ رسوائی کی
زندگی رات ہے اور رات بھی تنہائی کی

(مشفق خواجہ)

(۱)

۳-ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد،
کراچی۔ ۷۴۶۰۸

محترمی و مکرمی، سلام مسنون!

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے ذریعہ 'تذکرہ کاروانِ ہند' موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ کے اس گراں قدر علمی تحفے سے مجھے جو خوشی ہوئی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ شعرا کے تذکروں سے مجھ کو جو دلچسپی ہے، یقیناً اس کا علم آپ کو عارف نوشاہی صاحب سے ہوا ہوگا۔ اُن کا بھی ممنون ہوں۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں عرض کیا تھا کہ ڈاکٹر محمد علوی مقدم کے مقالے کا ترجمہ میں رسالہ 'غالب' میں شامل کروں گا جو ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ بعض دشواریوں کی وجہ سے اس رسالے کی اشاعت میں باقاعدگی پیدا نہیں ہو سکی۔ تاہم امید ہے کہ آیندہ دو تین ماہ میں دشواریوں پر قابو پا لیا جائے گا۔ رسالہ 'غالب' کے دو شمارے عارف نوشاہی صاحب کے ذریعہ پیش کر رہا ہوں۔

آپ نے گزشتہ سال اطلاع دی تھی کہ 'ایران میں اردو مخطوطات' والا کام جلد مکمل ہو جائے گا۔ اگر مکمل ہو گیا ہو تو ارسال فرمائیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی بزمِ اقبال کے رسالے 'اقبال' کا اردو ادب نمبر مرتب کر رہے ہیں۔ یہ مقالہ اس نمبر میں شامل ہو سکتا ہے۔

رسالہ 'روحِ ادب' کلکتہ میں مولانا آزاد اور ڈاکٹر مشائخ کے حوالے سے آپ کا مضمون دیکھا۔ ایک دلچسپ اور معلوماتی دستاویز ہے۔ تاہم ڈاکٹر مشائخ نے مولانا سے اپنے تعلقات کی روداد تفصیل سے بیان نہیں کی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ایک مرتبہ اور ڈاکٹر مشائخ سے اس موضوع پر گفتگو کریں۔ انھیں اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے مولانا آزاد کے بارے میں جو کچھ یاد ہو، اُسے قلم بند کر لیں۔ ڈاکٹر مشائخ ایک عرصے تک مولانا سے ملتے رہے ہیں، انھیں یقیناً بہت سے واقعات یاد ہوں گے۔ اس مضمون کے ساتھ آپ کی تصویر بھی دیکھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے کم عمر ہیں۔ اس تصویر نے تو مجھے تصویر بنا دیا!

اگر کبھی فرصت ملے تو ایک کام کیجیے۔ ایران کے ادبی رسالوں میں غالب کے بارے میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان کا اشاریہ بنا دیجیے۔ اس سے یہ جاننے میں مدد ملے گی کہ اہلِ ایران نے غالب سے کتنی دلچسپی لی ہے۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۳۰/۷/۹۱ء

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی شعبۂ اردو اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہیں اور عصر حاضر میں اردو کے معروف ناقد و محقق شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ کاروانِ ہند، تالیف احمد گلچین معانی، شائع کردہ آستان قدس رضوی مشہد۔ یہ دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ان شعرا کے ذکر میں ہے جو عہد صفویہ میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔

۳۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی، معروف محقق، مخطوطہ شناس و فہرست نویس۔ کئی کتابوں کے مصنف و مرتب و مترجم ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر محمد حسین مشائخ فریدنی۔ میرے مضمون کا عنوان تھا 'مولانا آزاد ایک ایرانی مصنف کی نظر میں'۔ مطبوعہ 'روح ادب' کلکتہ۔ ۱۹۹۱ء

---

(۲)

۳۔ ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد،
کراچی۔ ۷۴۶۰۸

برادر عزیز مکرم، سلام مسنون!

گرامی نامہ مورخہ ۱۰ اپریل آج ہی موصول ہوا جبکہ مقالہ (ایران میں غالب شناسی) جو آپ نے بعد میں پوسٹ کیا تھا، دو روز پہلے مل چکا تھا۔ اس سے آپ ڈاک کی ابتری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ کے تازہ گرامی نامہ میں میرے اس خط کا کوئی ذکر نہیں جو میں نے مارچ کے پہلے ہفتے میں لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ آپ کو نہیں ملا ہوگا۔ لہٰذا احتیاطاً یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں تاکہ لازماً آپ کو مل جائے۔

سب سے پہلے تو آپ کی عنایت کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب مل گئی تھی۔ یہ بہت ہی اچھا کام ہے۔ اسے میں غالب میں شامل کروں گا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے امید پر میرے مقالے کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ یہ شائع ہو جائے تو مجھے ضرور بھیجیے گا۔

آپ نے آزاد سے متعلق جو چیزیں طلب فرمائی تھیں، وہ عنقریب ڈاک سے بھیج دوں گا۔ قاقشال والے صفحات کے عکس بنوا لیے ہیں۔ سبحۃ المرجان کا اردو ترجمہ کتب خانۂ انجمن میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ کتب خانے کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے دوران بعض کتابیں غلط جگہوں پر رکھ دی گئی ہیں۔ جونہی یہ کتاب دستیاب ہوگی، عکس بنوا لیا جائے گا۔

آپ از رہِ کرم ایرانی کتابیں عنایت فرماتے رہتے ہیں۔ مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ آپ اتنی زحمت فرماتے ہیں اور میں کوئی خدمت نہیں کرتا۔ عارف نوشاہی صاحب سے بات کیجیے، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ جو کتابیں بھیجیں میں ان کی قیمت نوشاہی صاحب کو اُس وقت ادا کر دوں جب وہ یہاں تشریف لائیں۔ اس طرح مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ میں آپ کے لیے کم سے کم باعثِ زحمت ثابت [نہ] ہوں گا کیونکہ اِس زحمت کا تو کوئی بدل نہیں ہو سکتا کہ آپ کتاب حاصل کریں اور مجھے بھیجیں۔ آپ نے کرمان، یزد اور قم وغیرہ کے شعرا کے

تذکروں کا ذکر کیا ہے، میں ان تذکروں کو ضرور حاصل کرنا چاہوں گا۔ نیز ایک مخطوطے کا عکس بھی مجھے درکار ہے جس کا نام 'واقعات تفضل'[1] ہے اور جس میں تفضل حسین اور ان کے خاندان کے حالات ہیں۔

برادرم عارف نوشاہی صاحب سے میرا سلام کہیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۵/۹۳ء

---

1. میرے مضمون 'ایران میں اردو مخطوطات' مطبوعہ تحقیق، شمارہ ۵، (شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو) میں اس مخطوطے کا ذکر دیکھ کر خواجہ صاحب نے کتابخانۂ مرعشی قم میں موجود اس نسخے کے عکس کی فرمائش کی۔ میں نے عکس حاصل کرکے انھیں بھیج دیا تھا۔ وہ اس پر کام کرنا چاہتے تھے مگر شاید موقع نہ مل سکا۔ اس کتاب میں ریاست بہار کا تذکرہ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو 'ایران میں اردو مخطوطات' مطبوعہ فکر و تحقیق دہلی، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۶۱۔

---

(۳)

۳-ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد،
کراچی۔ ۷۴۶۰۸

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون!

آپ کے احسانات تلے میں اتنا دب گیا ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آپ نے ایسی ایسی عمدہ کتابیں بھیجی ہیں کہ دل سے دعائے خیر نکلتی ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے مجھ فقیر گوشہ نشین کو خوش کیا۔ آخری کتاب جو ملی ہے وہ 'تذکرۂ منظوم، ستیغ سخن' ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے مقالات اردو کا مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہیے۔ میں ان کی اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ فی الحال آپ ان مقالات کی فہرست عنایت کیجیے تاکہ سلسلہ جنبانی کرنے میں آسانی ہو۔

برادرم عارف نوشاہی صاحب بخیریت وطن واپس پہنچ گئے ہیں۔ ان سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ کراچی میں ان کا قیام بہت مختصر تھا، اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔

انجمن ترقی اردو کی مطبوعات کی فہرست بھیج رہا ہوں، آپ کو جن کتابوں کی ضرورت ہو لکھیے۔ یہ میری طرف سے تحفۃً پیش کر دی جائیں گی۔ انجمن کے دونوں رسالے اعزازی طور پر آپ کے نام جاری کر دیے ہیں۔ دفتر کو ہدایت کر دی ہے کہ ۱۹۹۳ء کے تمام شمارے آپ کو بھجوا دیے جائیں۔ غالب کے تینوں شمارے آپ کے ہندوستان کے پتے پر بھیجے جا رہے ہیں۔ 'جائزۂ مخطوطات اردو' اس خط کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

آزاد کے سلسلے میں آپ جن تذکروں سے استفادہ کر چکے ہیں، ان کی فہرست مجھے بھجوا دیجیے تاکہ میں ایسے تذکروں سے مواد حاصل کر سکوں جو آپ کو دستیاب نہیں ہو سکے۔

'واقعاتِ تفضّل' کو یاد رکھیے گا۔ مجھے اس کے عکس کی ضرورت ہے۔

آپ کے مقالے (ایران میں غالب شناسی) میں آپ کے ارشاد کے مطابق اضافے کر دیے گئے تھے۔ یہ مقالہ 'ارمغانِ علمی'[1] میں شامل کیا جا رہا ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس ارمغان پر لاہور میں کام ہو رہا ہے۔ یہ مقالہ انھیں کو بھیج رہا ہوں۔ اس ارمغان میں مقالہ نگاروں کے مختصر کوائف بھی ہوں گے۔ از رو کرم اپنا بایو ڈیٹا ارسال فرمایئے۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

اس وقت آپ کے سارے خط میرے سامنے نہیں ہیں، ممکن ہے کوئی بات جواب طلب رہ گئی ہو، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۱۲/۱۰/۹۳ء

---

[1] اس ارمغان علمی میں میرا مقالہ 'تذکرہ کاتبین' شامل ہوا۔ 'ایران میں غالب شناسی' نہیں۔ شاید اسے رسالہ 'غالب' کے لیے محفوظ رکھ لیا گیا جو ادارہ یادگار غالب کا مجلّہ تھا۔ پاکستان میں اس مضمون کی اشاعت کی مجھے خبر نہیں ہو سکی کہ کہیں چھپا یا نہیں۔ لیکن یہی مضمون 'غالب نامہ' دہلی جولائی ۱۹۹۳ء میں ضرور شائع ہوا۔

---

(۴)

۳-ڈی $\frac{۹}{۲۶}$، ناظم آباد،
کراچی - ۷۴۶۰۸

محترمی و مکرمی، سلام مسنون!

میں ایک شادی میں شرکت کے لیے لاہور گیا تھا۔ پروگرام تو دو چار دن کا تھا مگر اس سے کہیں زیادہ قیام کرنا پڑا۔ یہ قیام فایدے سے خالی نہیں رہا۔ بہت سے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور بہت سی کتابیں 'نئی اور پرانی' حاصل کیں۔ واپس آیا تو آپ کا ایک خط اور 'واقعاتِ تفضّل' کا عکس (مع خط) میرے منتظر تھے۔ اس سے پہلے 'قصاید جذب' کا ایک نسخہ مل چکا تھا۔ ان سب عنایات کے لئے تہِ دل سے ممنون ہوں۔

جذب کے قصائد[2] کا مطالعہ میرے لیے بیک وقت حیرت و مسرت کا باعث ہوا۔ حیرت اس بات کی کہ ایسا قادر الکلام شاعر اب تک پردۂ خفا میں کیوں رہا اور مسرت ... کہ آپ نے یہ قصاید شایع کر کے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ بلا شبہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ان کے قصیدے ان کی قادر الکلامی ہی کے نہیں بلندی فکر کے بھی آئینہ دار ہیں۔ ان قصیدوں کے مطالعے سے مجھے سچی ادبی مسرت حاصل ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہوا کہ آپ

جذبؔ کا باقی غیر مطبوعہ کلام بھی شائع کردیں۔

'واقعاتِ تفضّل' کو ابھی سرسری دیکھا ہے، یہ ایک نہایت معلوماتی کتاب ہے۔ ریاست پیرپور کی تاریخ بھی ہے اور مصنف کی آپ بیتی بھی۔ آپ نے بڑا کرم کیا کہ ایسی نادر کتاب کے حاصل کرنے میں مدد دی۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ اس مخطوطے کا عکس اپنے پاس بھی رکھ لیا۔ مٹی ہوئی عبارتوں کا مقابلہ اصل سے کریں تو مجھے بھی آگاہ فرمائیں۔ جو دو صفحات (۶۳-۶۴) اس میں کم ہیں، وہ بھی حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔

ڈاکٹر بدل نقوی کی جو کتابیں آپ نے طلب فرمائی ہیں وہ ان سے حاصل کر کے جلد ہی ارسال کروں گا۔

آپ نے انجمن کی جو کتابیں طلب کی تھیں وہ منگوا کر رکھ لی ہیں۔ چونکہ یہ ہندوستان کے پتے پر بھیجی جائیں گی اس لیے میں نے فوراً بھیجنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ آپ کے مطلب کی کچھ اور کتابیں مل جائیں تو پھر سب کتابیں ایک ساتھ بھیجوں گا۔

ڈاکٹر نذیر احمد کے مقالات کی اشاعت کی تجویز انجمن ترقی اردو کی اشاعتی کمیٹی کے سامنے رکھوں گا۔ امید ہے تجویز منظور ہو جائے گی۔

آپ چھ ماہ بعد ہندوستان واپس چلے جائیں گے۔ اردو ادب کے حوالے سے کرنے کے بے شمار کام ہیں۔ آج کل سب سے کم توجہ تدوینِ متون کی طرف دی جا رہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ دو چار اچھے شاعروں کے دیوان مرتب کر ڈالیں۔ بہت سے تذکرے (فارسی شعرا کے) غیر مطبوعہ ہیں، ان پر بھی کام ہو سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ اب تک مجمع النفائس (آرزو) اور ریاض الشعرا (والہ) جیسے اہم تذکرے مرتب نہیں کیے گیے۔ آپ اس جہت میں بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کتاب خانہ خدا بخش میں بہت کچھ ہے جو آپ تدوین کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی ارسال کردہ کتابیں اور تذکرے میرے کتب خانے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ پہلے بھی ان کا شکریہ ادا کر چکا ہوں اور اب پھر اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

پس نوشت گزشتہ ڈیڑھ سال سے نظیر صدیقی صاحب کراچی میں ہیں۔ ادارۂ ہمدرد کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے منسلک ہیں۔ ہر جمعہ کو باقاعدگی سے تشریف لاتے ہیں۔ میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں اس لیے وقت ان کے ساتھ بہت اچھا گزرتا ہے۔	خیر اندیش مشفق خواجہ ۹۴/۱/۹ء

۱؎ قصیدہ جذب' شاعر سید عباس علی جذب گوپال پوری (۱۹۱۶-ستمبر ۱۹۷۱ء) محمدؐ و آل محمدؐ کی شان میں قصاید پر مشتمل ہے جسے میں نے ۱۹۹۳ء میں شایع کیا تھا۔ اب ان کے دوسرے کلام بھی شایع کرنے کی فکر میں ہوں۔

۲؎ یہ تذکرہ پاکستان سے چھپ رہا ہے۔ پہلی جلد منظر عام پر آچکی ہے۔

۳؎ رام پور رضا لائبریری نے اس کی پہلی جلد شایع کر دی ہے۔ مرتب و مصحح پروفیسر شریف حسین قاسمی ہیں۔ تہران سے بھی یہ تذکرہ شایع ہو رہا ہے۔

(۵)

۳-ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد،
کراچی ـ ۷۴۶۰۸

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون!

آپ کا ۲۲رجون کا خط ملا۔ یاد فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا جو میں نے تذکرۂ شعرائے کرمان اور تذکرۂ مرآت الفصاحت کی وصولی پر لکھا تھا۔ کراچی میں جن دنوں گڑبڑ ہوتی ہے، ڈاک کا نظام بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔ آنے والے اور جانے والے، دونوں طرح کے خط ضایع ہوئے۔ بہر حال ان تذکروں کے لیے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے اتنی بہت سی مفید کتابیں بھیج کر مجھ پر جو احسان کیا ہے، اُس کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی جب یہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو میں نے اُن سے کہا تھا کہ آپ سے ضرور رابطہ کریں۔ واپسی پر وہ چند گھنٹوں کے لیے کراچی میں ٹھہرے تھے۔ وہ بہت دیر تک آپ کا تذکرہ کرتے رہے۔ آپ کے حسن سلوک سے بے حد متاثر تھے۔ مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی کتاب کے لیے انجمن کی منتظمہ کے سامنے تجویز رکھی گئی تھی۔ آج کل انجمن کی طرف سے انجمن کی پرانی مطبوعات شایع کی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ کہا گیا کہ جب تک پرانی کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ مکمل نہ ہو جائے کوئی نئی کتاب شایع کرنا ممکن نہیں ہے۔

آپ نے جن کتابوں کی فرمائش کی تھی، وہ سب میں نے حاصل کر رکھی ہیں۔ سابقہ خط میں عرض کیا تھا کہ آپ چونکہ اپنے وطن واپس جانے والے ہیں، اس لیے وہاں پہنچ کر اطلاع دیجیے گا تو میں یہ کتابیں بھجوانا شروع کر دوں گا۔ اطمینان ہونا چاہیے کہ کتابوں کا ہر پیکٹ جو بھیجا گیا، وہ منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ آپ وطن پہنچ کر اطلاع دیں گے تو میں پہلا پیکٹ روانہ کر دوں گا۔ اس کی موصولی کی اطلاع آئے گی تو دوسرا پیکٹ بھیجوں گا۔ اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ اکٹھے کئی پیکٹ بھیجنے کی وجہ سے کسٹم والے انھیں روک لیتے ہیں۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی ہے۔ فارسی میں تو آپ کا مقالہ

چھپے گا ہی[1]، آپ اس کا اردو ترجمہ بھی تیار کر لیجیے۔ پاکستان میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ کسی نہ کسی علمی ادارے سے اسے چھپوا دوں گا۔

انجمن کے دونوں رسالے ابھی آپ کے پتے پر نہیں بھجوائے گئے۔ جمع کر رکھے ہیں۔ مرتبے پر کتابیں اور مخطوطات کی فہرستیں بھی آپ کے لیے جمع کر رہا ہوں۔ آپ کو جس کتاب کی بھی ضرورت ہوگی، یہاں سے بھیجتا رہوں گا۔

'واقعاتِ تفضل' کی مٹی ہوئی عبارتوں اور گم شدہ اوراق کا خیال رکھیے گا۔ (۲)

عارف نوشاہی صاحب کا کیا حال ہے۔ ملاقات تو میرا سلام کہیے۔ مارچ کے آخر میں میں جب اسلام آباد گیا تھا تو ان کے دولت خانے پر بھی حاضری دی تھی اور ان کا کتب خانہ دیکھا تھا۔ کتب حوالہ کے اعتبار سے بے مثال ذخیرہ ہے۔ خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے کہ ان سے بڑے بڑے کاموں کی توقع ہے۔ یہ توقع مجھے آپ سے بھی ہے اور آپ سے انسیت کا سبب ہی یہی ہے کہ آپ کا علمی و ادبی انہماک بے مثال ہے۔

طہران میں ڈاکٹر محمد سلیم اختر[3] بھی رہتے ہیں۔ کیا کبھی ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ میرے بہت عزیز دوست ہیں اور بہت ہی لائق فائق۔ ان کا خط آیا تھا، میں نے جواب لکھا تھا۔ پھر ان کی طرف سے کوئی خط نہیں آیا۔ ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے گا۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کو ان کا پتا معلوم ہے۔

نظیر صدیقی صاحب کو کتاب دے دی تھی۔ امید ہے انھوں نے خط لکھا ہوگا۔ صدیقی صاحب ہر جمعہ کو غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں۔ میرے حال پر بہت مہربان ہیں۔

احتیاطاً یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کو لازماً مل جائے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۹۳/۶/۲۸ء

۱۔ انتشارات دکتر محمود افشار تہران نے اس مقالے کو 'احوال و آثار میر غلام علی آزاد بلگرامی' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا ہے۔ اردو میں بھی یہ کتاب تیار ہے بس زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کی دیر ہے۔

۲۔ اس کی مٹی ہوئی عبارتوں کو اصل نسخے سے لکھ کر اور گمشدہ اوراق کے دوبارہ عکس لے کر بھیج دیے تھے۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات رہتی تھی۔ مجھ پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔ ان دنوں اسلام آباد میں ہیں۔ میرے Viva میں پروفیسر نذیر احمد صاحب کے ساتھ شرکت کی تھی۔

(۹)

۳-ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد،
کراچی ۷۴۶۰۰

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون!

'تذکرہ دل کش' از حاجی اکبر نواب شیرازی موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ میرے کتب خانے میں آپ کے ارسال کردہ دیگر تذکروں کی طرح ایک قیمتی اضافہ ہے اور آپ کے خلوص کی تابندہ نشانی۔ آپ کے ارسال کردہ تذکرے ایسی جگہ پر رکھے ہیں کہ ہر وقت اُن پر نظر پڑتی رہتی ہے۔ گویا آپ ہر وقت میرے سامنے رہتے ہیں۔

کتاب کی موصولی سے پہلے آپ کا ایک خط بھی ملا تھا جس سے آپ کی مصروفیات کا علم ہوا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوئی تھی کہ آپ 'ایران میں اردو' کے موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ موضوع کے تمام پہلوؤں کا نہایت عمدگی سے احاطہ کریں گے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اس کتاب میں ایران میں موجود اردو مخطوطات کی فہرست بھی شامل کر دیں۔ فارسی میں اردو کی کچھ کتابوں کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ ان کا ذکر بھی ضرور کیجیے گا۔

آزاد کے تذکروں کی ترتیب کی اطلاع بھی دلی مسرت کا باعث ہے۔ 'غزلان الہند' کب تک چھپ جائے گا؟ آزاد کا دیوان آپ جب مرتب کر لیں تو اطلاع دیجیے گا۔ اس کی طباعت کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

آپ کب تک اپنے وطن واپس جائیں گے، اس کی اطلاع فوراً دیجیے گا تاکہ میں یہاں سے کتاب بھیجنا شروع کر دوں۔

امید ہے ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر عارف نوشاہی سے ملاقات ہوتی ہوگی۔ ان دونوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجیے۔ پچھلے مہینے محمد عبداللہ قریشی اور اس مہینے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی اطلاع مذکورہ دونوں دوستوں کو دے دیجیے گا۔ محمد عبداللہ قریشی بہت بلند مرتبہ صاحب علم تھے۔ اقبال پر اُن کا کام نہایت اعلیٰ تحقیقی معیار کا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تو استادوں کے استاد تھے۔

ہر جمعہ کو غریب خانے پر دوستوں کی محفل جمتی ہے۔ نظیر صدیقی صاحب باقاعدگی سے تشریف لاتے ہیں۔ آپ کا خط اور کتاب انھیں دے دی تھی۔ امید ہے انھوں نے رسید بھیجی ہوگی۔

'فرہنگ سخنوران' (خیام پور) کی طبع جدید کی جلد اول (الف تا س) میرے پاس ہے۔ کیا اس کے بعد کی جلد بھی چھپ گئی ہے؟ اگر آپ بھجوا سکیں تو کرم ہوگا۔

یہ خط لکھ چکا تھا کہ تازہ ڈاک میں عارف نوشاہی صاحب کا خط ملا۔ انھوں نے سلیم مظہر کا ترجمہ (افسانہ جلال آل احمد) 'قومی زبان' کے لیے بھیجا ہے۔ انھیں بتا دیجیے کہ یہ افسانہ ان شاء اللہ جلد ہی 'قومی زبان' میں چھپ جائے گا۔

صحت و شادمانی اور علمی ترقیوں کی دعا کے ساتھ۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۲۱/۹/۹۴ء

۱؎ کتاب کا درست نام 'غزلان الھند' ہے۔ یہ نام تاریخی ہے اس سے ۱۱۷۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے قومی کونسل دہلی نے مالی امداد منظور کی ہے۔

---

(۷)

۳-ڈی ۹/۳۶، ناظم آباد،
کراچی۔ ۷۴۶۰۰

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون!

جنوری کے دوسرے ہفتے میں آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا۔ 'مونس الارواح' بازار میں کہیں نہ ملی۔ جو پتا آپ نے لکھا تھا وہ غلط تھا۔ کئی مرتبہ مکان تلاش کیا نہ ملا۔ کل شام، افطار کے بعد، ایک مرتبہ پھر کوشش کی۔ ایک اسٹیٹ ایجنسی والے نے مدد کی تو مکان مل گیا۔ قمر جہاں صاحبہ کے بھائی کا مکان تھا۔ انھوں نے بتایا کہ کتاب کا اسٹاک کسی دوسری جگہ رکھا ہے۔ وہ وہاں سے لائیں گے اور پھر مجھے فون کریں گے۔ اگر اگلے چند روز میں کتاب مل گئی تو ایران کے پتے پر پوسٹ کردوں گا، ورنہ ہندوستان کے پتے پر۔ اپریل تک تو آپ ایران ہی میں ہیں نا؟ قمر جہاں صاحبہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر ہادی حسن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے یہ کتاب مرتب کی تھی لیکن انتقال کی وجہ سے اسے ڈگری کے لیے داخل نہ کیا جا سکا۔ مرحومہ کے بھائی ایسے 'بخیل' تھے کہ کتاب کی ایک جھلک بھی مجھے نہ دکھائی۔

'یک نادر مجموعہ مکاتیب' رسالہ ارمغان میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ الگ کتابی صورت میں نہیں چھپا۔ اگر آپ فرمائیں گے تو اردو کے دو تین ۔ ۔ ۔ بھجوادوں گا جن میں یہ کتاب چھپی ہے۔ اکرام چغتائی صاحب اسے الگ کتابی صورت میں چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب جب چھپے گی، آپ کے لیے حاصل کرلوں گا۔ ڈاکٹر بیدی احمد کی کتاب بھی ان شاء اللہ حاصل کروں گا۔ آپ جب ہندوستان پہنچ کر اطلاع دیں گے تو میں یہاں سے کتابوں کی ترسیل شروع کردوں گا۔ آپ کے تمام خطوط میں نے ایک جگہ محفوظ رکھے ہیں۔ ان کو ایک مرتبہ دیکھ لوں گا تاکہ آپ کی کوئی مطلوبہ کتاب بھیجنے سے نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو میں نے خط لکھ دیا تھا۔ امید ہے انھوں نے آپ کی مطلوبہ کتابیں بھجوا دی ہوں گی۔ 'ایران میں اقبال شناسی' والی کتاب کا مسودہ انھیں بھجوا دیجیے۔ اس کے لیے آپ کسی قرارداد وغیرہ کا انتظار نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کا زبانی فرما دینا ہی کافی ہے۔

آپ میرے لیے کتابیں حاصل کرنے میں جو زحمت اٹھاتے ہیں، اس کے لیے بے حد شرمندہ ہوں۔ میں اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا اور یاد رکھنے کا میرے نزدیک بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ کو جب بھی پاکستان کی چھپی ہوئی کسی کتاب کی ضرورت ہو، بلا تکلف مجھے لکھیے۔

مجھے تفضل حسین والے آپ کے خط کا بھی انتظار ہے تاکہ میں اپنا نسخہ مکمل کر سکوں۔

چند روز ہوئے عارف نوشاہی صاحب کا خط آیا تھا جس کے ساتھ انھوں نے بنگلہ دیشی اسکالر شمیم صاحب[1] کا مضمون بھیجا ہے۔ ملاقات ہو تو میرا اسلام کہیے گا اور یہ بھی کہ یہ مضمون ایک رسالہ 'دائرے' میں شائع ہو جائے گا۔

ڈاکٹر محمد سلیم اختر صاحب سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہیے گا۔ ان کا ایک خط آیا تھا جس کا جواب میں نے لکھ دیا تھا۔ پھر ان کی طرف سے کوئی خط نہیں آیا۔

نظیر صدیقی صاحب کراچی میں سوا دو سال کے قیام کے بعد اسلام آباد واپس چلے گئے۔ بعض گھریلو مسائل کی وجہ سے ان کا کراچی میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ ان کے جانے سے میں اُداس ہوں۔ وہ میرے نہایت مخلص دوست ہیں۔ کراچی میں جب تک رہے، ہفتے میں کم از کم دو ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

کراچی کے حالات آپ اخبارات میں دیکھتے ہوں گے۔ زندگی خوف و ہراس کے عالم میں گزرتی ہے اور پھر میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں حالات کچھ زیادہ ہی خراب ہیں۔ دعا فرمائیے۔

ہندوستان واپس جا کر آپ کا شغل کیا ہوگا؟ کیا ملازمت کا پہلے سے انتظام ہے یا کوشش کرنی ہوگی۔

میری دعا ہے کہ آپ خوش و خرم رہیں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۹۵/۴/۳۰ء

---

1. قمر جہاں جعفری لکھنؤ کے ایک محترم خانوادے کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد کا نام ایس ایم جعفری ہے۔ ان کی ولادت ۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ گھریلو مذہبی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول لکھنؤ میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۶ء میں اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ وہ ۱۹۲۹ء میں انگلستان گئیں اور وہاں سے مونٹیسری سسٹم آف ایجوکیشن میں ڈپلوما کیا۔ واپسی پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بہ حیثیت استاد ان کا تقرر عمل میں آیا۔ وہاں وہ نمبروارڈ بورڈنگ ہاؤس کی سپرنٹنڈنٹ بھی رہیں۔ اپنی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود انھوں نے علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں فارسی میں ایم اے کیا اور وہیں سے 'شہزادی جہاں آرا بیگم حیات اور کارنامے' پر پروفیسر ہادی حسن کی زیر نگرانی ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ لکھا۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلی گئیں جہاں ۷؍جون ۱۹۵۰ء کو ایک حادثے

میں ان کی موت واقع ہوگئی۔ ان کا تحقیقی کام ان کے بھائی حامد علی نے ۱۹۹۳ء میں کراچی سے شائع کر دیا۔ جس میں مونس الارواح کا فارسی متن مع مقدمہ بزبان انگریزی شامل ہے۔ یہ کتاب مجھے اس وقت تو نہیں لیکن اب مل گئی ہے۔

۷ ان کا پورا نام ڈاکٹر محمد شمیم خان ہے۔ یہ راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں استاد ہیں۔ انھوں نے تہران یونیورسٹی سے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

---

(۸)

۳-ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد،
کراچی - ۷۴۶۰۸

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون!

آپ کا ارسال کردہ ادراک کا شمارہ ۳ موصول ہوا۔ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک طویل مدت کے بعد رابطے کی کوئی صورت نکالی۔ پرچے کا معیار ماشاء اللہ بہت عمدہ ہے۔ اور معیار کیوں نہ عمدہ ہو کہ آپ کو ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہے۔

شاعری اور افسانہ نگاری کے لیے بے شمار رسالے شائع ہوتے ہیں۔ یہ اصناف انھیں کے لیے رہنے دیجیے۔ آپ علمی کاموں کے لیے اپنے رسالے کو وقف رکھیے۔

حکیم سید ظل الرحمن صاحب کا گوشہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ چند برس پہلے حکیم صاحب کراچی تشریف لائے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جیسی علم و عمل کی یکجائی ان کی ذات میں دیکھی، ویسی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ خدا انھیں تا دیر سلامت رکھے۔

محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے بہت اچھا کیا کہ اپنے نام کے نظیر صدیقی مرحوم کے خطوط شائع کر دیے۔ نظیر صدیقی بہت اچھے مکتوب نگار ہیں۔ ان کے خطوط مرتب ہو کر شائع ہونے چاہئیں۔ اگر کوئی یہ کام کرے تو میں اپنے نام کے سیکڑوں خطوط دینے کو تیار ہوں۔

عارف نوشاہی صاحب سے سال میں ایک آدھ مرتبہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ یہاں تشریف لاتے ہیں اور کبھی میں اسلام آباد چلا جاتا ہوں۔ ہر ملاقات میں آپ کا ذکر لازما ہوتا ہے۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف یاد فرمائیے۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۰۰۳/۴/۱۹ء

پس نوشت: تاخیر سے خط لکھنے کا سبب یہ ہے کہ میں شدید بیمار رہا۔ چار ماہ تک گھر سے باہر رہا اور اب صحت یاب ہو کر واپس آیا ہوں تو معمول کی زندگی شروع ہوئی ہے۔

٭ بقیہ ص 197 پر

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میرؔ کی نایاب فارسی مثنوی : دریائے عشق

محمد تقی میرؔ کو غزل گوئی کا بادشاہ کہا گیا ہے لیکن وہ مثنوی کے فن میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی اردو مثنویوں کی تعداد اڑتیس (۳۸) بتائی جاتی ہے۔ جس میں نو (۹) مثنویاں عشقیہ ہیں۔

میرؔ کی عشقیہ مثنویوں میں 'دریائے عشق' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں جو قصہ بیان ہوا ہے اسے میرؔ ہی کے ہم عصر، غلام ہمدانی مصحفیؔ نے بھی مثنوی 'بحر المحبت' کی صورت میں پیش کیا۔ 'دریائے عشق' اور 'بحر المحبت' دونوں کی بحر بھی ایک ہی ہے۔

میرؔ نے مثنوی 'دریائے عشق' کے قصے کو پہلے فارسی نثر میں لکھا تھا اور بعد میں اردو مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے رضا لائبریری رامپور میں موجود کلیات میرؔ کے قلمی نسخے کا تعارف پیش کرتے ہوئے یہ اطلاع دی تھی کہ مذکورہ کلیات میں مثنوی 'دریائے عشق' (اردو) سے پہلے بطور تمہید، 'نثر دریائے عشق' بھی شامل ہے جو 'مثنوی کے قصے کو فارسی نثر میں دہراتی ہے'۔ عرشی صاحب نے دریائے عشق نثر فارسی کا متن بھی قلمی نسخے سے نقل کر کے 'دلی کالج میگزین' (میر نمبر-۱۹۶۲ء) میں شائع کرا دیا تھا۔ اسی کی نقل رسالہ 'نقوش' لاہور کے خصوصی شمارہ اگست ۱۹۸۳ء (میر تقی میرؔ نمبر ۳) میں دوبارہ شائع ہوئی۔

مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیقی کاوش سے ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ مثنوی 'دریائے عشق' کا قصہ فارسی نثر میں میرؔ نے لکھا تھا لیکن ہمیں یہ علم نہ تھا کہ میرؔ نے اس قصے کو فارسی مثنوی کی صورت میں بھی پیش کیا ہے۔

پروفیسر نیر مسعود کی کوششوں سے میرؔ کا فارسی دیوان تو منظر عام پر آچکا ہے جو ۵۲۲ غزلوں، ۱۰۴ رباعیات، ایک مثنوی اور ایک منقبت پر مشتمل ہے لیکن فارسی مثنوی دریائے عشق اس میں نہیں ہے۔

شعبۂ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے 'سر سلیمان کلکشن' میں میرؔ کی فارسی مثنوی 'دریائے عشق' کے مخطوطے پر اتفاق سے راقم الحروف کی نگاہ پڑی۔ یہ مخطوطہ ۲۲ صفحات یعنی گیارہ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کی لمبائی چھ انچ اور چوڑائی ساڑھے تین انچ ہے۔ کتابت سیاہ روشنائی سے جلی حروف میں کی گئی ہے۔ کاتب کا نام اس میں کہیں درج نہیں ہے لیکن مثنوی کے اخیر میں 'تمت تمام شد مثنوی دریای عشق از تصنیفات

میر تقی مرحوم، یکم جولائی ۱۹۲۸ء درج ہے جس سے تاریخ کتابت کا علم ہوتا ہے۔

یہ مخطوطہ مجلد ہے اور اس پر لٹن لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (Lytton Library) کی پرچی بھی چسپاں ہے جس میں مخطوطے کا قدیم اندراج نمبر (۳۴/۴۰ء۷) درج ہے لیکن اس کا نیا اندراج نمبر (۳۴/۵۹ء۷) ہے۔ 'Sir Sulaiman Collection' کی مہر بھی اس پر ثبت ہے۔

مثنوی دریائے عشق کے اشعار کی تعداد ایک سوستر (۱۷۰) ہے اور مثنوی کے درمیان چھ اشعار کی ایک غزل بھی شامل ہے۔ (یہ غزل بھی دیوان فارسی، مطبوعہ میں موجود نہیں ہے)۔

مثنوی دریائے عشق (اردو) اور دریائے عشق (فارسی) دونوں ایک ہی بحر (بحر خفیف مسدس مخبون مقصور یا محذوف = بروزن فاعلاتن مفاعلن فعلن) میں ہیں۔

مثنوی دریائے عشق (فارسی) کا متن مذکورہ نسخے سے نقل کر کے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مثنوی دریائے عشق

(میر تقی میرؔ)

۱	بعد تحمید شاہد مطلق	وز پس نعت عاشق برحق
۲	سرور عاشقان ذات خدا	بلکہ محبوب حضرت مولا
۳	من کہ غمگینم از خیال کسے	محو حیرانی جمال کسے
۴	می نمایم بیان شیدائی	می نویسم حدیث رسوائی
۵	از تب ہجر سینۂ بریان	وز غم و رنج دیدۂ گریان
۶	بہ دلش داغ عشق محبوبان	بہ زبان ذکر خوبی خوبان
۷	از کمان ابروان صید شکار	داشت پیوستہ خواہش دیدار
۸	شمع روئے کہ نور برخے دید	مثل پروانہ گرد او گردید
۹	روزے آں دل فگار خستہ جگر	ناگہاں جانبے نمود گذر
۱۰	بہ سر او بلائے تازہ رسید	کہ بہ یک غرفہ آفتے جاں دید
۱۱	خم ابروش تیغ خوں ریزی	نوک مژگاں بلا بلا خیزی
۱۲	وائے از یک نگاہ بار دگر	صورتش را ندید آں مضطر
۱۳	پیچش کاکل پریشانش	کرد بے تاب مو بہ مو جانش

۱۴	دلِ او سر بسر پریشاں شد	پا بہ زنجیرِ زلفِ پیچاں شد
۱۵	جگرش شد کباب زآتشِ غم	خاطرش گشت پایمالِ الم
۱۶	بر دلش بار دورِ چرخِ کہن	از سرِ نو نہادہ بارِ محن
۱۷	ہر دم آں غم زدہ بہ حالِ تباہ	داشت از شوق سوے غرفہ نگاہ
۱۸	گاہ می گفت کاے مہِ خود کام	جلوہ فرما ز ناز بر لبِ بام
۱۹	گاہ می گفت از براے خدا	مردم آسا بہ چشمِ غرفہ در آ
۲۰	نظرے کن سوے منِ ناکام	از رہِ عینِ لطف اے گلفام
۲۱	بر درت ایستادہ ام دلدار	مستمندانِ سائلِ دیدار
۲۲	اے جفاکیش وے ستم اندیش	تیرِ مژگانت کردہ دل را ریش
۲۳	روز در انتظار می گذرد	شب بہ صد اضطرار می گذرد
۲۴	کہ دہد مژدۂ وصالِ ترا	کہ نماید مرا جمالِ ترا
۲۵	کہ رساند بہ تو پیامِ مرا	کہ بگوید ترا سلامِ مرا
۲۶	نہ کسے غمگسار و نے غم خوار	کہ شود ملتفت بہ حالِ زار
۲۷	بہ وفا عاشقِ جمالِ تو ام	بہ خدا طالبِ وصالِ تو ام
۲۸	بہ جفاکاریم مکوش اے شوخ	بہ دل آزاریم مجوش اے شوخ
۲۹	بہ فراقِ تو اے گلِ رعنا	دامنِ دل گرفت خارِ بلا
۳۰	بہ دلے زیں نمط بہ حالِ تباہ	داشت ایں گفتگو بہ نالہ و آہ
۳۱	چوں ز احوالِ زارِ آں نالاں	آگہی یافتند پیر و جواں
۳۲	از دلِ دور دادِ شاں بردند	بہ دلِ خویشتن گماں بردند
۳۳	گر ہمیں خانہ ہا کسے باشد	ورنہ ایں جا چرا کسے باشد
۳۴	جملہ یک بار حملہ آوردند	بر سرِ او ستم روا کردند
۳۵	ہم بہ رسوائیش براہِ قہر	جمع کردند کودکانِ شہر
۳۶	گہ کسے گفتش اے الم انگیز	بہتر است آں کہ زیں مکاں برخیز
۳۷	گاہ گفتش کسے کہ اے ناشاد	بے محابا عبث مکن فریاد
۳۸	گہ کسے رو بہ شور و شر آورد	گہ کسے خنجر و تیر آورد
۳۹	گہ کسے آہ دست و پاش ببست	گہ کسے از سرِ غضب بر جست

۴۰ که یکے بر رخش طمانچه زد — دیگرے بر تنش کمانچه زد
۴۱ قطرۀ مهر کس نکرد بر او — ظلم کم یک نفس نکرد بر او
۴۲ گرچه او از جفاے خرد و بزرگ — مبتلا بود در عذابِ مرگ
۴۳ لیکنش لب به شکوه نکشود — بیشتر وصلِ شوقِ یار افزود
۴۴ پس همه اقرباے ماه جبیں — زیں ملامت شدند شرم آگیں
۴۵ پدرش را یقین شد که جواں — نشترِ عشق خورده بر رگِ جاں
۴۶ هست از وصل کار ایں ناکام — نیست هرگز خیالِ ننگ و نام
۴۷ به دلِ شکسته سخت اندیشید — وسعِ ایذا بروئے یار کشید
۴۸ شد به تدبیر و کاوشے مایل — که ازاں ایں بلا شود زایل
۴۹ بهرِ تسکینِ خاطرِ جاناں — کرد تجویزِ انتقالِ مکاں
۵۰ هم زباں گوهرِ گراں مایه — لازم آمد خراسبِ دایه
۵۱ تا به دلداریش ز حکمت و چند — دلِ آزرده اش کند خورسند
۵۲ آخر او را به دایۀ غم خوار — وقتِ شب در محافه[1] کرد سوار
۵۳ تا که آمد قریبِ آں بیمار — گردش آگاه جذبۀ دلِ زار
۵۴ چار و ناچار پس به حالِ تباه — از رهِ شوق شد رواں همراه
۵۵ رازِ عشق نهاں عیاں می کرد — حالِ غم همچناں بیاں می کرد
۵۶ عشق آمد بلاے جاں آمد — آفتِ سخت ناگهاں آمد
۵۷ به دلم ایں چناں گرفت قیام — که نمانده ست نامِ ننگ و نام
۵۸ قوتِ ضعف و شوکتِ عجز است — مسندِ خاک و صولتِ عجز است
۵۹ فرحتِ جاں به آه و زاری داد — لذتِ دل به اشکباری داد
۶۰ برقِ اندوه سوخت خرمنِ عیش — پنجۀ غم درید دامنِ عیش
۶۱ از هجومِ ملالت و آفت — شد به من تنگ عرصۀ راحت
۶۲ بختِ ناساز سازِ ناکامی — ساخت از بهرِ من به بدنامی
۶۳ لختهاے جگر دلِ محزوں — می چکاند ز دیدۀ پرخوں
۶۴ رهزنِ بے قراریِ دلِ زار — برد از من به زور صبر و قرار

---

[1] ڈولی

۶۵	نقدِ جانم نثارِ روے تو شد	تنِ من خاکِ راہِ کوے تو شد
۶۶	ہر چہ در عشقِ تو دلم اندوخت	سر بہ سر مایۂ الم اندوخت
۶۷	ہر یکے رو بہ شور و طعنہ کشید	کل بہ زخمِ جگر نمک پاشید
۶۸	عاقبت شد بسر زمانِ شکیب	رفت از دستِ دل عنانِ شکیب
۶۹	نیست ایں راہ و رسمِ دلداری	کہ مرا بے مراد دل داری
۷۰	بکشا پردہ از رخِ گلگوں	بنما جلوہ از قدِ موزوں
۷۱	بہ تکلم درآ بتِ خود بیں	بہ تبسم کشا لبِ شیریں
۷۲	بس میاموز طرزِ بیگانہ	رحم کن بر من آشنا یانہ
۷۳	گفتگوے جواں بہ نعرہ و آہ	خورد در گوشِ دایۂ بد خواہ
۷۴	سر بروں کرد و از محافہ دید	سست گردید و ہم بہ جاں رنجید
۷۵	چہ بلایے شکست واے نصیب	کیں جواں در پے است واے نصیب
۷۶	چہ کنم چوں روم کجا باشم	کہ ازیں جلا جدا باشم
۷۷	سخت رسوائی است بودنِ او	سخت مشکل جدا نمودنِ او
۷۸	بہتر ایں بود ہجرِ یار و دیار	یار ہمراہ ماندہ آخرکار
۷۹	زیں ہمش فکر شد کہ آں شیدا	نبرد جاں سلامت از دریا
۸۰	پیش خود خواند گفت کاے ناشاد	دلِ خود را بہ غم مدہ برباد
۸۱	بلبلانہ مدار از غم باک	گر تو داری چو گل گریباں چاک
۸۲	گر ترا دردِ ہجرِ او شاق است	خاطرِ یار نیز مشتاق است
۸۳	جذبۂ او کشیدہ است ترا	ہاں ندانی کہ عاشقی تنہا
۸۴	ہم سخن بود دایہ با شیدا	کہ محافہ رسید بر دریا
۸۵	حاملاں خود محافہ را بردند	بہ سفینہ چو جاں بہ تن کردند
۸۶	ہم بہ صد ذوق و پاسِ آں بیمار	بہ سفینہ سوار شد ناچار
۸۷	دایہ از بسکہ داشت کاوش و کد	تا کند دفع ایں بلاے بد
۸۸	ناگہ ایں طرح ناصواب انداخت	کفشِ پایش بہ روے آب انداخت
۸۹	بعد ازاں گفت کاے حزین و ملوم	حالِ عشقِ تو خوب شد معلوم
۹۰	کہ نگارِ تو آہ بے دستور	پا برہنہ کند ز ہجر عبور

۹۱ گر تو داری محبت دلدار — بہتر است آں کہ کفش یار بیار

۹۲ ورنہ زیں پیروی لا حاصل — کے رسد دست بر مراد دل

۹۳ حسب تحریک دایۂ مکار — در تقاضاے عشق یا درکار

۹۴ کمر عزم بر میان بر بست — غرض از شوق دل بہ دریا جست

۹۵ بود نا آشناے کار آب — آمد افسوس زیر بار آب

۹۶ غوطہ خوردند گرچہ غواصاں — لیکن از وے نیافتند نشاں

۹۷ دایہ چوں دید حیلہ و تزویر — کارگر شد بہ خواہش تقدیر

۹۸ ایں بگفت از محافہ برداراں — کہ از آں جا شوند جلد رواں

۹۹ پس در آں جا کہ دایہ عزم نمود — حاملان محافہ زود از زود

۱۰۰ آمدت راہ ہیچ نگردند — بے تامل محافہ را بردند

۱۰۱ از محافہ چوں او فرود آمد — جان تازہ بہ جان او آمد

۱۰۲ آخر الامر بے محابانہ — رفت ہمراہ دایہ در خانہ

۱۰۳ صاحب خانہ از رہ اُلفت — پیش آمد بغایت شفقت

۱۰۴ رخ او شمع دودماں پیداست — جلوہ اش رونق مکاں پیداست

۱۰۵ ہر یکے زاں نگار چوں عشاق — راست آہنگ کرد بہر وفاق

۱۰۶ نقش امید او درست نشست — کہ ز چنگ ہم مخالف راست

۱۰۷ صحبت ہمسراں نمود پسند — حک شد از لوح جانش حرف گزند

۱۰۸ گرچہ آں گل عذار از حد بیش — پیش خاطر نہاد مذہب خویش

۱۰۹ لیک عشق از سر جفا و کیں — داشت در دست خود کماں بہ کمیں

۱۱۰ عشق غارت گر متاع شکیب — ہر کرا می کشد بہ دام فریب

۱۱۱ گاہ در ہجر می نماید غم — گاہ از وصل می کند خرم

۱۱۲ گاہ مایل شود بہ شور و شر — گاہ ریزد نمک بہ زخم جگر

۱۱۳ گاہ باعث شود بہ بدنامی — گاہ موجب شود بہ ناکامی

۱۱۴ گہ انیس محافل خوباں — گہ جلیس حضور محبوباں

۱۱۵ لامکانی مکان عشق بود — بے نشانی نشان عشق بود

۱۱۶ عشق را رتبۂ رسائی ہاست — قوت طبع آزمائی ہاست

۱۱۷ کششِ عشق خود اثر دارد   دل بہ دل واقفی خبر دارد

۱۱۸ جانِ عاشق اگر زَوَد برباد   دلِ معشوق ہم شود ناشاد

۱۱۹ ناگہاں عشق فتنہ برپا کرد   بہ دلِ آں نگار ہم جا کرد

۱۲۰ یک بہ یک سخت بیقرارش ساخت   ملتجی میلِ دوستدارش ساخت

۱۲۱ مضطرب کرد آں چناں کہ ز درد   دم بہ دم بود گرم آہِ سرد

۱۲۲ گاہ پنہاں ز چشمِ اہلِ مکاں   گریہ می کرد از غمِ ہجراں

۱۲۳ گاہ بر خویش می نمود نظر   می برآورد گاہ دردِ جگر

۱۲۴ مرگِ او را بہ زیست فایق شد   دلش آزردہ از علایق شد

۱۲۵ آہ خم شد ز دردِ جاں فرسا   قدِ آں مہ جبیں ہلال آسا

۱۲۶ طاق شد چوں ز طاقت آں گل رو   رفت نزدیک دایۂ بدخو

۱۲۷ مخفی نیست نیک می دانی   کہ اماں یافت ز آفتِ جانی

۱۲۸ آنچہ اندیشہ بود زایل شد   از بلایم نجات حاصل شد

۱۲۹ پس مرا بہر ایزدِ سبحان   زود زیں جا بہ خانہ ام برساں

۱۳۰ ورنہ از غم ہلاک خواہم شد   ز آتشِ ہجر خاک خواہم شد

۱۳۱ فکر آورد رو بہ افزایش   رفت از جاں قرار و آسایش

۱۳۲ نیست کم از بلاے آفت زا   قلقِ ہجرِ والدین مرا

۱۳۳ عیشِ من تلخ کرد آخر کار   دورِ گردونِ دونِ ناہنجار

۱۳۴ دایہ فی الفور حسبِ گفتنِ او   کرد بہرِ روانگی تگ و پو

۱۳۵ در محافہ سوار کرد او را   شد رواں باز جانبِ دریا

۱۳۶ از کمالِ نشاط فرحتِ دل   رفتہ رفتہ رسید بر ساحل

۱۳۷ چوں در آں حال دایۂ غدّار   شد بہ یک کشتی سوار با دلدار

۱۳۸ گفت آں نازنیں کہ بہرِ خدا   بہرِ تفریحِ جانِ غم ما

۱۳۹ پردہ وا کن کہ سیرِ آب کنم   شستہ گردد مگر غبارِ الم

۱۴۰ ہم بہ ایں ناتوانِ غم دیدہ   خبرے کن کہ آں ستم دیدہ

۱۴۱ یعنی آں بسملِ نگاہِ من   عاشقِ زار و بے گناہِ من

۱۴۲ کرِ ترکِ جاں بیست کجا   بہرِ گفتم بہ آب جست کجا

۱۴۳ در فنِ مکر دایه کامل بود — لیک از کارِ عشق غافل بود
۱۴۴ این ندانست کاں خلل انداز — هم فریبنده است و هم دمساز
۱۴۵ جنگ دارد بدانش فرهنگ — می دَرَد پردهٔ حیا و ننگ
۱۴۶ به هجوم سپاه رنج و ملال — می کند ملکِ جان و دل پامال
۱۴۷ از محافه چو پرده را وا کرد — آشنا از خروشِ دریا کرد
۱۴۸ به مقامے که عاشق سرشار — گوهرِ جاں به کفش کرد نثار
۱۴۹ زاں مکاں نیز اطلاع نمود — دلِ او بیشتر به غم آلود
۱۵۰ به مجرد که دایه گفت این جا — این عشق سوختن جاں را
۱۵۱ از میانِ سفینه جست بر آب — گشت غایب در آں بسانِ حباب
۱۵۲ دولتِ وصلِ یار حاصل کرد — راحتِ بے شمار حاصل کرد
۱۵۳ در تهِ آب اشتیاق کمال — خوش در آراستند بزمِ وصال
۱۵۴ بر گرفتند کامِ همدوشی — شاد گشتند از هم آغوشی
۱۵۵ دایه زیں وارداتِ هوش رُبا — کرد از حد فزوں فغاں برپا
۱۵۶ هیچ مجز رفتنش علاج نساخت — مضطرب گشت و سوے خانه شتافت
۱۵۷ حالِ این واقعه ملال آگیں — گفت ناچار از کهین و مهین
۱۵۸ خواهر و مادر و اَب و عمِ او — اشک ریزاں شدند از غمِ او
۱۵۹ هر یکے شورِ حشر برپا کرد — سازِ برگِ الم مهیا کرد
۱۶۰ آخرش اقرباش گریه زناں — سوے دریا همه شدند رواں
۱۶۱ طلبیدند دام داراں را — از پے جستجوے آں شیدا
۱۶۲ چند غواص در شدند به آب — آشنایانِ آب همچو حباب
۱۶۳ بعد دیرے به جستجوے تمام — بر کشیدند سوے ساحل دام
۱۶۴ دام آورد خود به شوقِ کمال — ماهیِ بحرِ عشق و ماهِ جمال
۱۶۵ چوں ز دریا به ساحل آوردند — همه بر حالِ شاں نظر کردند
۱۶۶ لب به لب آمدند دوش به دوش — ساق بر ساق دست در آغوش
۱۶۷ به تماشاے هر دو بے جانے — عالمے جمع گشت و حیرانے
۱۶۸ چوں نباشد به عشق دل بازاں — هم چنیں است وصل جاں بازاں

۱۶۹	باش خاموش ازیں بیانِ الم	مکن احوالِ جورِ عشق رقم
۱۷۰	بس زیادہ بہ عرصۂ تبیاں	گرم جولاں مکن سمندِ زباں

مثنوی کے درمیان ۶ اشعار کی جو غزل درج ہے اسے علاحدہ لکھا جا رہا ہے۔

غزل

۱	چہ نماید جدائی تو مرا	چہ کند خود نمائی تو مرا
۲	وائے حسرت ز جاں بجاں آورد	عالمِ بے وفائی تو مرا
۳	کرد بیگانہ از جہانِ خرد	خواہشِ آشنائی تو مرا
۴	ز اقتدار سعادتِ شاہی	بہتر است ایں گدائی تو مرا
۵	تا کجا در عذاب خواہد داشت	راست گو کج ادائی تو مرا
۶	منفعل کرد اے دلِ پُرغم	بہ جہاں نارسائی تو مرا

ڈاکٹر ظفر کمالی

بازیافت

غالبؔ کا ایک نودریافت اردو قطعۂ تاریخ

اپنے دورانِ مطالعہ، فارسی کی ایک مطبوعہ طبی تصنیف 'تکشیف الحکمۃ' میں غالبؔ کا ایک قطعۂ تاریخ نظر سے گزرا۔ میری معلومات کی حد تک یہ قطعہ غالبؔ کے کسی مجموعے میں موجود نہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر اہم دریافت ہے۔

'تکشیف الحکمۃ' ایک سو نواسی صفحات پر مشتمل حکیم محمد سلیم خاں کی طبی تصنیف ہے۔ اسے انھوں نے ۱۲۷۸ھ میں لکھنا شروع کیا اور یہ ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) میں تکمیل کو پہنچی۔ منشی نول کشور کے مطبع کانپور سے غالبؔ کی وفات کے بعد یہ جون ۱۸۷۲ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ مصنف نے اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ 'حقیر پر تقصیر اثیم محمد سلیم المتخلص بالطبیب ولد محمد حکیم خاں مرحوم خلف الصدق حکیم محمد عبداللطیف خاں، امر طلا متوطن شاہجہاں آباد است جناب حکیم اجمل خاں صاحب موصوف کہ ایں نحیف را سلسلۂ فرزندی و تلمیذی باںجناب مربوط است ' (ص ۲-۳)۔ کتاب کے آخر میں مصنف کے قطعہ کے علاوہ مزید چھ قطعات تاریخ ہیں جن میں آٹھ اشعار پر مشتمل آخری قطعہ غالبؔ کا ہے جو درج ذیل عنوان کے تحت ہے

'قطعۂ تاریخ اختتام از نتائج فکار سر آمد فارسی دانانِ ایران سلطان الشعراء ہندوستان انجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المشہور مرزا نوشہ دہوی متخلص باشد و غالب۔'

اب قطعہ ملاحظہ ہو۔

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشم واصل خاں — حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام

تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے — کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

اسے فضائل علم و ہنر کی افزایش — ہوئی ہے مبدعِ عالم سے اس قدر انعام

کہ بحث علم میں اطفالِ ابجدی اس کے — ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام

عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے اک اس نے — کہ اس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام

نہیں کتاب ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع — نہیں کتاب ہے اک معدنِ جواہر کام

کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے — تامل فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام

کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے
لکھا ہے نسخۂ تحفہ یہی ہے سالِ تمام
۱۲۷۹ھ

❁

پروفیسر سید امیر حسن عابدی
سابق صدر شعبۂ فارسی
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

یحییٰ کاشی اور ان کے دیوان کا ایک انتخاب

میر یحیی کاشی کے والد، میر سید محمد جعفر شیرازی مشہور بہ کتب دار، کاشان میں آکر رہنے لگے جہاں یحیی کاشی کی ولادت ہوئی۔ آپ نے کہا ہے:

پدرم این خطا بہ عرفان کرد　　　کہ ز شیراز جا بہ کاشان کرد

۱۰۳۳ھ/۲۴-۱۶۲۳ء میں آپ ہندوستان آئے اور شاہجہان بادشاہؒ کے کتابدار بنے نیز دارا شکوہؒ کی مدح میں قصیدے کہنے لگے۔ علاوہ بریں ابوطالب کلیم کاشانیؒ اور محمد جان قدسی مشہدیؒ سے آپ کا مقابلہ رہتا ہے۔

جب ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء میں ساٹھ لاکھ کی لاگت سے دہلی کا لال قلعہ بنا تو آپ نے تاریخ کہی۔

ع　　شد شاہجہان آباد از شاہجہان آباد

جس پر شاہی خزانے سے سو اشرفیاں انعام میں ملیں۔

یحییٰ کو شاہجہاں نامہ لکھنے پر مامور کیا گیا تھا لیکن جب یہ بیت کہی

سر راجپوتان جگت سنگھ بود　　　کہ بر شیشۂ نہ فلک سنگ بود

تو محمد علی ماہرؒ نے قافیہ پر اعتراض کیا۔ بالآخر بادشاہ نے ان کو اس کام سے الگ کر دیا۔

محرم ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ انتقال پر یہ تاریخ کہی گئی:

احیای سخن چو کرد یحییٰ، جان داد

نیز ان کے مزار پر یہ شعر کندہ کیا گیا:

ای کہ از دشواری راہ فنا ترسی مترس
بسکہ آسان است این رہ می توان خوابید ورفت

مولف روز روشن کے مطابق: صاحب آفتاب عالمتاب نے یحییٰ کاشی اور یحیی لاہیجیؒ کو ایک کر دیا ہے، جو ایک بڑی غلطی ہے۔

صاحب الذریعہ نے ان کو قاضی یحییٰ لکھا ہے نیز نصرآبادی کے حوالے سے ان کا اصل وطن

لاہیجان بتلایا ہے، جو غلط ہے۔ صاحب الذریعہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کاشان واپس آ گئے تھے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

مولف تذکرہ حسینی نے آپ کو 'موسی مصر خوش تلاش' [7] اور صاحب نتائج الافکار نے 'دمساز سخن تلاش' [8] لکھا ہے۔ مولف 'کاروان ہند' نے آزاد بلگرامی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ 'میر یحییٰ کاشی شاعریست، احیای معانی کارش و جان در کالبد سخن دمیدن شعارش' [9]۔ نیز لکھا ہے کہ تذکرہ نصر آبادی میں قاضی یحییٰ نور بخش لاہیجی کے ذکر میں میر یحییٰ کاشی کا ذکر آ گیا ہے۔ علاوہ بر ایں شاہجہان آباد کی تعمیر کے سلسلے میں بجائے یحییٰ کاشی کے میر یحییٰ قمی کا نام لے لیا گیا ہے۔ صاحب کاروان ہند نے یہ بھی لکھا ہے کہ والہ داغستانی، آذر بیگدلی اور دوسرے بعد میں آنے والے تذکرہ نویسوں نے بھی دسویں صدی کے شاعر قاضی یحییٰ لاہیجی اور میر یحییٰ کاشی کو جو گیارہویں صدی ہجری کے شاعر ہیں، ایک کر دیا ہے۔

منتخب دیوان یحییٰ کا ایک قلمی نسخہ، غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں موجود ہے [10] اس میں صرف منتخب غزلیں ہی نہیں بلکہ ان میں سے بھی منتخب اشعار دیے گئے ہیں۔ اس نسخہ میں تقریباً ۲۶۴ اشعار ہیں۔ یہ نسخہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

'نی   امید آفتاب ما   کز رشک زہر کرد فلک در شراب ما

اس نسخے کے مطالعے سے شاعر کی سیرت اور زندگی کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ انھوں نے بار بار وطن سے دوری کا ذکر کیا ہے:

تا سنگ دل نکند ز کہساریت نشد   عزت طلب چرا نشود از وطن جدا

کسی دور از وطن تا کی بہ غربت در بہ در گردد   کہ یارب چرخ دون ہمچون   در گردد؟

تر می در خاک غربت نیست من ہم چون نہال
مشت خاکی از وطن ای کاش بر می داشتم

عام شعرا کی طرح یحییٰ نے بھی زاہدوں اور واعظوں کا مذاق اڑایا ہے

ریش واعظ گر پس از مرگش بدست افتاد من
وقف مسجد کردمی این دستۂ جاروب را

بعد ازین وعظ ار گر نخوم زاہد مرنج
از چہ فریاد این قدر کردی کہ گوشم کر شود

واعظ جبینی بتر از مجلس تو نیست   آزار خلق چند کنی از خدا بترس

یحیٰی کے کلام میں آورد، دور از کار خیالات کی کثرت، تصنع اور خیال آفرینی ملتی ہے نیز وہ تمثیل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اب یہاں کچھ منتخب اشعار نقل کیے جا رہے ہیں۔

از شرب وصل نشاسم ز خود محبوب را   گشتہ ام مست آنچنان کز بد ندانم خوب را

نی ز کری می شود عریان سر میخوارہا   می زنند از دست غفلت بر زمین دستارہا
در کف سر رشتہ دارن ریا تسبیح نیست   خاک بر سر کردہ اند از دست شان زنارہا
خاکساری می شود از سرفرازی بیشتر   کی بہ پایلی می خلد خار از سر دیوارہا

خاطر سنبل پریشان از خیال موی اوست   گل ز شبنم در عرق از خجل روی وست

روکناری گیر گریش جہ نست آرزو دست   کس در، شنای شنا کی سیر دریا کردہ است

در اول عشق ضبط دیدار   دشوار چو تو بہ در بہار است
ایمن نشود کہ اژدہا نیست   آن دوست کہ با تو یار غار است
عز مطلب کہ تاج شاھان   از گوھر و لعل و سنگسار است

شی کان زلف و رویم در نظر نیست   بہ کامم لذت شام و سحر نیست

عشق تا در سر بود عریان تنی دشوار نیست   سر چو از می گرم گردد حاجت دستار نیست

کشش حسن بہ حدیست کہ چون کاغذ باد   نامہ ہر جا کہ فرستی بہ تو وا می گردد

تو برم حاضر و من در طلبت سرگردان   ہمچو کوری کہ بہ دنبال عصا می گردد

بلبل ز بی ثباتی گل نالہ کرد و گفت   این باغ را مگر ز حباب آب دادہ اند

ہر کہ دم زد از ہنر خود را ز غم رنجور کرد   گل ز بوی خویش زخم خویش را ناسور کرد

زخم دل ویش نہ از رحم است   جای پیکان خویش می بیند

ز داغ دل شدم آگہ چو ہمرہان رفتند   کہ غیر آتشی از کاروان نمی ماند

بجو ز خلق دیانت کہ مال حق را ہم   برند با خود و یا در آخرت حساب دھند

ہم بزم غیر گشت کہ ہجران طلب شوم   می گیردم بہ مرگ کہ راضی بہ تب شوم

عکس تو گر در آب تماشا کند کسی   آن بخت کو کہ پیش دو بالا کند کسی
از صد ہزار مردہ بہ میراث ماندہ است   زین زندگان ہر آنچہ تمنا کند کسی
یحیٰی اگر وصال سخن فہم رو دھد   کی آرزوی دیدن عنقا کند کسی

اس نسخہ میں غزلیات کے بعد چند رباعیاں بھی ہیں۔ یہاں صرف یک رباعی بطور نمونہ دی جا رہی ہے

راہی ست عدم کہ بی خبر باید رفت
ہر چند کہ ہست بی خطر باید رفت
رفتار جنازہ ہر کہ بیند داند
کاین راہ دراز را بہ سر باید رفت

اس نسخہ کی کتابت پنجشنبہ کے دن ۱۲ / جمادی الاول ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء کو تمام ہوئی ہے۔

حواشی.

۱۔ ۱۰۳۷ - ۱۰۶۸ھ/۱۶۲۸-۱۶۵۸ء

۲۔ ۱۰۲۴ - ۱۰۶۹ھ/۱۶۱۵-۱۶۵۹ء

۳۔ وفات : ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۴ء

۴۔ وفات : ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء

۵۔ وفات : ۱۰۸۱ھ/۷۱-۱۶۷۰ء

۶۔ وفات : ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء

۷۔ میر حسین دوست سنبھلی   تذکرہ حسینی، ص ۳۷۳، مطبع نولکشور، ۱۸۷۵ء

۸۔ محمد قدرت اللہ گوپاموی   تذکرہ نتائج الافکار، ص ۷۸۸، چاپخانہ سلطانی بمبئی، ۱۳۳۶ش

۹۔ احمد گلچین معانی   کاروانِ ہند، جلد ۲، ص ۱۵۵۲، آستان قدس رضوی (مشہد) ۱۳۶۹ش

۱۰۔ نمبر ۴۴۴/۹۱۰۵۱۰۲۱ وی

❁

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

تذکرہ ہائے شعرائے فارسی — ایک تعارف

راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانہ میں نادر و نایاب اور بیش بہا فارسی مخطوطات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ آج سے ۳۰ سال قبل میں نے ان مخطوطات کی تفصیلی فہرست مرتب کرلی تھی اس دوران میں نے چند اہم اردو مخطوطات مرتب کر کے شائع کیے اور فارسی مخطوطات کی طرف توجہ دے نہ سکا۔ دیر آید درست آید کے مصداق اور سالہا سال گزر جانے کے بعد مجھے اس بات کا احساس شدت سے ہونے لگا کہ جو ضروری اشعار (غیر مطبوعہ) اہم اقتباسات اور تحریریں میں نے محفوظ کرلی تھیں کم از کم ان کا تعارف کرایا جائے۔ ان میں سے بہت سی چیزیں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ مثلاً۔

(۱) **منتخب شعرائے اکبر شاہ** (تذکرۂ شعرا، علما، درویشان از عہد تیمور گورگاں تا شہنشاہ اکبر اعظم)۔

قسم اول۔ 'خانخاناں، علی قلی خان الملقب بہ خان زماں، سلطان تخلص غزنوی۔ میرزا خان، علی، میرزا جانی، وقاری، میرزا غازی بن میرزا جانی، میرآں، صدر جہاں، لائقی، محمد قلیج بیگ، جعفر بیگ قزوینی، میرزا امیر شاہ، میرزا خان تخلص نائی، راجہ لون کرن کچھواہہ کہ در حضور اقدس تربیت یافتہ۔

قسم دوئم از شعرائے عالی فطرت۔ اول ملک الشعراء غزالی، مولانا غزالی مشہدی، خواجہ حسن ثنائی مشہدی، شیخ فیضی، قاسم کاہی کابلی، عرفی شیرازی، عرفی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> 'مولانا عرفی شیرازی، در اصل نام سید محمد است ولد زین الدین علوی بن جمال الدین مشہور بخواجہ چادر۔ در مآثر رحیمی اوصاف عرفی بسیار نمود کہ از ہمہ شاعران معاصر خود فائق بود۔

شخصے در تاریخ وفات گفتہ ؎

عرفی شہ مسند سخن پردازی	روحش چو نمود از مکاں پروازی
ہادی کلام تشنہ تاریخش شد	'ہادی کلام عرفی شیرازی' = ۹۹۹ ہجری

صوفی کشمیری، حزنی اصفہانی، نظیری نیشاپوری، منوچہر چغتائی کابلی، خواجہ حسن ہروی، بیٹے تکلو میرزا قلی۔ الہی شاہ طوبٰی، محوی ہمدانی، صالحی میر، میرزا اسمٰعیل بیگ شاہو، قراری گیلانی نور الدین، صرفی ساوجی، وقوعی نیشاپوری، خسروی قائنی، شیخ ساقی، شیخ رہائی، وفائی اصفہانی، شکیبی سپاہانی، مولانا حیاتی گیلانی، رفیعی کاشی حیدر، یادگار حالتی،

میر سنجر پسر میر حیدر معمائی، غیرتی شیرازی، مولانا محب علی سندی، جذبی شاہ قلی، مولانا غیوری، ملا علی مہر کن دہوی، اسیری رازی، اشکی قمی، قیدی شیرازی، جہی رازی، کاتی سبزواری، ہیروی ساوجی امیر بیگ، سید محمد جامہ باف، پیامی عبد السلام، حیدر تبریزی، قدسی کربلائی، فسونی شیرازی، فریبی، سامری پسر حیدر تبریزی، ملا نظیری، سرمدی اصفہانی، دخلی اصفہانی، میرزا باقی میر عرب شاہ مشہدی، شاہ پور رازی، قاسمی مازندرانی، خواجگی سلطان احمد، مظہری کشمیری۔

قسم سوم علماء کبار کہ در ملازمت اکبر شاہ بودند۔

مولانا جلال الدین الملقب ۔ شیخ احمد، مولانا عبد اللہ سلطان پوری الملقب بہ مخدوم، مولانا محمد سعید المشہور بمولانا میر کلان، عبد اللطیف ابن منیر بخشی قزوینی، حکیم شمس الدین محمد الملقب بحکیم الملک، شیخ عبد النبی صدر بن شیخ احمدی، حکیم شمس الدین علی الملقب بہ معین الملک، مولانا علاء الدین لاری ابن کمال الدین، میر رضی الدین مرتضی ابن میر سید مولانا مفلس، حافظ تاشکندی او را حافظ کوہی نیز گویند۔ مولانا حسین بغدادی، مولانا صادق حلوائی، مولانا سعید ترکستانی، شیخ مبارک پدر فیضی و ابو الفضل ہندوستانی، حکیم ابو الفتح و حکیم ہمام و حکیم نور الدین فرزندان مولانا عبد الرزاق بن مولانا لطف ۔ دانشمند گیلانی، قاضی نظام الدین المعروف بقاضی خان، مولانا شاہ محمد شاہ آبادی، شیخ منور لاہوری، قاضی عبد الصمد، عالی جناب سیادت پناہ علامی میر فتح اللہ شیرازی۔ مراتب و رتبت ایشان از ہمہ علماء مذکور زیادہ بود۔

درویشان علماء کہ در ایام امیر تیمور گورگان صاحب قران بودند۔

شمس الدین کلال، درویش صاحب کمال بود۔ سید برکہ درویش کامل۔ بابا سکو درویش، مولانا زین الدین، حضرت بہاء الدین نقشبند۔ نام ایشان محمد بن محمد، مولانا سعد الدین مسعود بقارانی، مولوی معنوی، شیخ شمس الدین، محمد بن ضریری، مولانا کمال خجند شیخ فتح محمود زنگی عجمی کرمانی۔ علامہ میر سید شریف جرجانی عالم بود و زیرک مصنف چند کتاب عربی مشہور است۔ مولانا نظام الدین شاقی، مولانا نور الدین بغدادی۔

علماء و صلحاء و شعرائے ملازم و معاصر سلطان حسین میرزا بادشاہ ایران از اولاد امیر تیمور۔

مولانا نور الدین جامی، امیر علی شیر، شہم بیگ، خواجہ آصفی، شیخ [illegible] یوسف الدین احمد، مولانا شیخ حسین عالم، مولانا عثمان جرجی، میر مرتاض حکیم، مولانا مسعود شروانی دانی مرید [illegible] مولانا جامی، میر جلال الدین محدث، میر عطاء اللہ، قاضی اختیار، میر یوسف شاگرد شیخ الاسلام [illegible] نا بانی، ستائی صاحب دیوان، عبد اللہ جامی صاحب مثنوی، ملا میر حسین معمائی کہ ہیچ کس باآں خوبی معما نگفتہ، ملا محمد بدخشی، ملا محمد بدیعی، قصاید پرکار می گفت۔ ملا آہی۔ غزل عاشقانہ در سوز و گدازی گفت۔ محمد صالح صاحب دیوان است۔ شاہ حسین کاہی غزل گو

---

1 شاقو، درست ہے۔ (عباس)

بود، ملّا ہلالی، غزل و ہلالی می گفت۔ اہلی خراسانی۔

عماد درویش و شعراء عمل سلطان خاقان سعید بن میرزا شاہرخ میرزا ابن امیر تیمور گورگان۔

خواجہ محمد، ساد ہو محمد بن محمود دین البخاری، امیر غیاث الدین، خواجہ حسن عطار، شیخ محی الدین طوسی، میر نعمت اللہ، در ماہان در سنہ اربعہ وثلاثین وثمان ماتہ وفات یافت۔ مولانا نور الدین لطف اللہ المشہور بہ حافظ ایزدی ہروی، ابو القاسم انوار۔ در سنہ سبعہ وثلاثین وثمان ماتہ در جرجین مضافات جام وفات یافت۔ مولانا شرف الدین علی یزدی، مولانا شمس الدین ہروی، مولانا جعفر تبریزی، مولانا ظہیر، مولانا شمس الدین وعبد اللہ، مولانا شیخ محمود ابن مقلعہ۔

اسم صلحاء وعلماء ایام الغ بیگ مرزا گورگان بن خاقان سعید بن شاہرخ مرزا ابن امیر تیمور صاحبقرانا غ بیگ مرزا بادشاہ، عالم و فاضل و در علم ریاضی و ہندسہ رمل یگانہ زماں بود و فاضل و عالم و فقیر را دوست می داشت و بسیار خلیق و حلیم بود۔ و رصد بستہ بود۔ آخر عبد اللطیف پسرش ناسعادت مند بود۔ بقتل پدر فرمان داد۔ عباس غلام الغ بیگ را در اثناء راہ حج بشہادت رسانید۔ تاریخ فوت او ایں است ؎

الغ بیگ آں شہہ جم اقتدار	کہ دین نبیؐ را باو بود پشت
ز عباس شہد شہادت چشید	شدش سال تاریخ 'عباس کشت'

۸۵۳ھ

دپس از شش ماہ امرائے سمرقندی عبد اللطیف را کشتند۔ چنانچہ گوید ؎

بدکیش بادشاہے را نشاید
اگر شاید بشش ماہے نپاید

'اسم علماء وصلحاء کہ در عہد او بودند'۔

گویند کہ اہل فضل و علم آں قدر بحضور الغ بیگ جمع شدہ بودند کہ اگر بہ تفصیل آں پردازند، دفترے دیگر باید۔ بہ احوال چند کس کہ اعجوبۂ روزگار بودند اکتفا نمود۔

اوّل مولانا غیاث الدین جمید۔ در علم ریاضی و نجوم وحید زمان بود۔ و در ساختن و بستن رصد با مولانا معین الدین و مولانا (کرم خوردہ) الدین بن موسیٰ شریک غالب بود۔ و در جمیع علوم یگانہ۔ مولانا سنائی۔ آں مولوی بجمیع علوم بہرۂ وافی داشت۔ و تصنیفات بسیار نمود۔ ازاں جملہ شرح موجز بہ شرح اسباب و علامات مشہور است۔ مولانا یقین طبیب در علم رمل یگانہ بود و ہر حکم کہ می کرد غلط نمی شد۔ حکایات ایشان بسیار است۔ قاضی محمد شمس المشہور بہ مسکین بہ صفت علم و تقوی و اجرائے اوامر شریعت غرا وحید زمانہ بود۔ سید عاشق محتسب بہ صفت تقویٰ موصوف بود۔

'علماء و فضلاء و شعراء در عہد ظہیر الدین بابر'۔

'میر ابو البقا عالم بود۔ در علم ریاضی و حکمت درجۂ کمال داشت۔ شیخ زین، عالم و شاعر، ابو الواحد فارغی شاعر، سلطان محمد کوسہ شاعر۔ مولانا شہاب الدین معمائی کہ حقیر تخلص داشت۔ مولانا یوسفی طبیب خرائی، شیخ و داعی و مولانا بقائی کہ مثنوی در زمین مخزن بنام حضرت بابر گفت و داد سخن دادہ۔ خوند میر مورخ و مصنف حبیب السیر و خلاصۃ الاخبار کہ بعد سلطان حسین میرزا از ایران آمدہ بود۔ خواجہ نظام الدین علی و امیر درویش محمد ساربان کہ مرید حضرت ناصر الدین عبد اللہ احرار قدس سرہٗ۔ خواجہ کلال .....

سلطان محمد این چہار امراء بودند'۔ تمام شد

(۲) تذکرۂ جواہر العجائب۔ مولفہ سلطان محمد فخری ہروی۔

تقطیع۔ '۸×$\frac{1}{2}$ ۵'، سطر ۱۵، سال کتابت ۳/ ذی قعدہ ۱۱۹۳ ہجری۔ نام کاتب اعتصام الدین ولد صمصام الدین۔ مقام کتابت کلکتہ۔ یہ شاعرات فارسی کا غالباً پہلا تذکرہ ہے۔ اس کا دوسرا نام 'تذکرۃ النساء' بھی ہے۔ یہ فخری نے شاہ طہماسپ حسینی کے عہد سلطنت (۹۳۰ء-۹۸۴ء) میں محمد عیسیٰ ترخان (متوفی ۹۷۴ء) کے عہد میں سندھ میں تالیف کیا تھا۔ ابتدا میں دیباچہ ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے

'جنت مکانی شاہ حسین میرزا انار اللہ برہانہٗ از جہان فانی بسرائے جاودانی رخت بست و برادرش امیر کبیر عالمگیر آفتاب نظیر سلطان نشاں و سایہ رحمت میرزا عیسیٰ ترخان خلد اللہ ملکہ بر مسند ایالت نشست۔ گاہے بملازمت بلقیس رفیع مکان، ہمائے دوران و دلشاد زمان و قیدآفہ عالی شان محل رحمت.. و چراغ اقبال، قبیل ارغون حاجی بیگم زید اللہ عمرہٗ و دولتہا می رسید و از الطاف بیکرانہ آنحضرت بہرہ مندی می گردیدم'۔

تذکرہ ۹۴۷ ہجری میں تالیف کیا گیا تھا۔ تاریخ شعر کے مصرعۂ ثانی سے نکلتی ہے۔

خود را ز خود بہر تو غائب دیدم   تاریخ ہمہ غم ز مصائب دیدم

تذکرے میں ۳۰ خواتین کے مختصر حالات ہیں۔ منقول خاتم اور نزدی ترکی میں شعر کہتی تھیں۔

لکھنو کے شاہی کتب خانوں (فرح بخش اور توپ خانہ) میں بھی اس کے دو نسخے تھے (اودھ کیٹلاگ ص ۹، ڈاکٹر اشپرنگر مطبوعہ ۱۹۵۴ء)۔

(۳) شعر خیال۔ یعنی شرح زنانہ بازار (غیر مطبوعہ)

تقطیع۔ '۵×۸'، اوراق ۱۵۱، سطر ۱۶، خط نستعلیق۔

'شعر خیال' تذکرۂ زنانہ بازار کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۱۱ ہجری کے اعداد نکلتے ہیں کتاب کے مصنف سید اشرف خیال ہیں۔ اس میں ان الفاظ اور اشعار کی تشریح کی گئی ہے جو عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ کتاب کی ابتدا ذیل کے دیباچے سے ہوتی ہے :

' ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنكونن من الخاسرين و صلّ علىٰ سيدنا محمدٍ و آل محمد كما تحب و برضايان نصلى عليه .. . می گوید ممنون منت است بے شمار ایزد متعال امیدوار بخشش بے ہمال خدائے لایزال ابو العجز ارشد اشرف متخلص بہ خیال کہ پاس خاطر یاران صمیم و دوستانِ قدیم رسالہ مختصرے در شرح زنانہ بازار پرداختم۔ و پارۂ عمر عدیم المثال و قریب الانتقال را دریں کار در باختم۔ امید از دوستان باانصاف و بزرگان بے اعتساف آنکہ ایں بیرنج خیال را بچشم عیب پوش اصلاح کوش مطالعہ فرمودہ۔ ایں عاصی خطا کار بے اعتبار را بدعائے خیر یاد فرمایند۔ کہ انا اللّٰه لا يضيع اجر المحسنين ۔

ابیات :

فارغ چو شدم ز سیر بازار	رفتم بے نام پیش دلدار
مطرب پسرے ہوا پرستے	از بادۂ حسن خویش مستے
لولی بچہ کرشمہ سازے	بیگانہ آشنا نوازے
از آتش عشق زخمہ سوزے	بر نقد ملال کیسہ دوزے
بگرفت ز دستم ایں رسالہ	سرمایۂ عقل دید سالہ
دارم خبر از زبان راوی	دیدش بہ نگاہ کنجکاوی
در لطف معانی آں ستم کیش	چوں کرد نظر فتاد از خویش
با جودت عقل و تیزی ہوش	دیوانہ شد و ز خود فراموش
آمد چو بہ ہوش آں سخن گوش	بیرنج خیال گفت در گوش
در ماہ وفات و روز مرنج	تاریخ شد است لفظ 'تاریخ' ۱۲۱۱ھ
گفت آنکہ بدیر کام و ناکام	باغ (۱۰۰۳) است و بہار (۲۰۸) سال اتمام

از بسکہ 'خیال شعر' باقی	کردہ است دریں کتاب وافی
۱۲۱۱ھ

با 'شعر خیال' گشت نامی	ہنگامہ نمائی سحر گاہی
۱۲۱۱ھ

چوں 'شعر خیال' نام آں شد
۱۲۱۱ھ

تاریخ ز۔ نام او عیاں شد

متن۔ 'عصمتیان روپوش، حیا پرور، وخلوتیاں عفت کوش، پاک نظر را مژدہ باد۔'

'شرح۔ عصمت بالکسر، باز داشتن ونگاہ داشتن از گناہ وخوف۔ کسے وبالضم والکسر کردن بند وروپوش وحیاپرور، صفت بعد صفت است۔ برائے عصمتیاں وعفت کوش، پاک نظر۔ نیز صفت بعد صفت برائے خلوتیاں حاصل معنی آنکہ مصنف لہ عفت گزینیاں حیا پرور وخلوت نشینان پاک نظر را کہ طالب منجیات اند ومتحرز از مہلکات مژدہ سیر بازار تازہ کاری رساند۔ نہ خراجیاں کوچہ گردوسیہ کاران بازار تور ورازیرا کہ صوفیان زاویہ گزین، اصحاب تمکین اند وسوقیان بازار نشین ارباب تکوین جمہور۔ اول قابل رغبت است وثانی لائق تر ہست۔ وحاش کہ عصمتیاں روپوش وخلوتیان عفت کوش را از دیدن صنع باری کہ یاد از صانع می دہند۔ تحاشی باشد کہ سالکان طریقت گفتہ اند۔ ابیات۔

بے جلوۂ یوسف نہ کشیدیم قیدے
ہیہ کہ ز کوزۂ می نخریدیم ہنر بود

ورق ۱۵۱ ب۔ 'ترقیمہ۔ تمام۔ تمام شد شرح مینا بازار ظہوری بخط خام میرزا محمد زکی۔ مدت یک ماہ تمام شد۔ ۱۲۸۱ ہجری۔'

(۴) تذکرۂ شعرا فارسی۔

تقطیع۔ ۸' × ۴ ½'، اوراق ۱۶۲ ب (۳۲۴ صفحات) سطر ۱۷، بخط ایرانی نستعلیق۔

مخطوطے کا پہلا اور آخری ورق غائب ہے۔ تذکرے اور اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ مصنف ایرانی تھا۔ اس نے یہ تذکرہ شاہ عباس ثانی کے عہد حکومت میں لکھا تھا۔ ورق ۲ ب پر ۱۱۳۰ ہجری کی تاریخ درج ہے۔ تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب نہیں کیا گیا۔ اس کی ابتدا میرزا طاہر وحید سے ہوتی ہے اور آخر میں ملا افلاکی کا ترجمہ ہے۔

کتاب میں 'فرقۂ اول' در ذکر علماء و فضلاء' کے تحت درج ذیل لوگوں کے حالات اور نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔

میر محمد باقر، شیخ بہاء الدین محمد، آقا حسین گیلانی، ملا حسن علی، شیخ محمد خاتون، ملا محمد تقی، ملا ضیاء الدین، مرزا مہدی، ملا محمد طاہر، مظفر حسین، ملا میرک جان، نصیری ہمدانی، ملا علی رضا، کمال اسمٰعیل، مولانا امین وقار، سید مرتضیٰ امیناتی فراہانی، مرزا علی خان، مرزا محمد مجذوب، مولانا عباس، مرزا ابراہیم، ملا عشرتی۔

فرقۂ دویم 'در ذکر خوش نویسان' — مولانا رضا علی، میر عماد۔

فرقۂ سویم 'در ذکر اشعار درویشان' — قاضی اسد، درویش محمد صالح، میر معز۔

صنف چہارم 'در ذکر شعرا و موزونان و آں مشتمل است بر دو فرقہ'۔

حکیم شفائی (متوفی ۱۰۳۷ھ - شاہ دیں شفائی داد جان را = ۱۰۳۷ ہجری)

حکیم رکنائی کاشی، ابو طالب کلیم، طالب آملی، حاجی محمد جان قدسی، محمد قلی سلیم، زلالی (ہفت کتاب مثنوی، در بدیں موجب محمود و ایاز، آرزو و سمندر، شعلۂ دیدار، میخانہ، ذرہ و خورشید، سلیماں نامہ، حسن گلو سوز، در مدح ہر یک از چہاردہ معصومین چہاردہ قصیدہ گفتہ)۔

شیخ علی نقی کمرہ، ملا زکی ہمدانی، آقا شاپور، غیرت حلوائی، ملا شکوہی، قاضی یحییٰ، میر یحییٰ، میر مغفور، ملا زمانی، فصیحی، ملا اوجی، مصنف، شریف، میرزا رضی دانش، مرشد، میر معین علی، میر الٰہی، مرزا جانی، عزتی، ملا روحی، ملا واقف، تسلی، میر مغیث، تائب کرمانی، تائب تفرشی، اشتی، میر عبد الغنی تفرشی، ملا قیدی شیرازی، ملا شرمی قزوینی، قیدی کرمانی، میر قزوینی، فضلی جرپادقانی، یحییٰ شیرازی، ملا ملہمی، عرشی یزدی، ملا دری قمی، حسن بیگ رفیع، محمد رضا فکری، ملا میری جرپادقانی، میرزا نظام، مرزا صادق دست غیب، میر رحمتی آرتیمانی، یوسفی جرپادقانی، ملا ذوقی، ملا ذوقی کاشی، ملا فتحی، امیر ابوالحسن، شیخ شاہ نظر، ملا مومن، میر عقیل، ملا مخفی رشتی، ملا حشری تبریزی، ملا قوشی شوشتری، میر افسر، کامی سبزواری، مذاقی، قاسمی میرفی، خضری لاری، خضری خوانساری، سعدی دکنی، بابا سلطان، اختری یزدی، میر عیسیٰ یزدی، ملا نویدی، نویدی طہرانی، قطمی، محمد حسین بیگ معلوم، میرزا محسی، کلامی اصفہانی، ملا غروری، میر غروری، سروری، میر محمد مومن، عاقلا، شہوری، میر اجری، حسین صراف، نعیما، حسین بیگ ملا کرمی، شعری مشہدی، ملا طاہری، ضیا طہرانی، میر جعفر معظم، آقا حقی، میرزا ہادی، ملا مقیما علمی، تقی اوحدی، طبعی، اسیری، صفیانی، طاہر عطار، امینا، ملا عصری، باقیا، ملا افضل ہجتی، ملا قاضی، ملا غیاث، نجومی کاشی، ملا حسین آشوب، مازندرانی، میر سعد اللہ، میر شریف سعیدائی (بہند رفتہ) موسنائی، نورس، شیخ جنتی، حیاتی گیلانی (در ہند نشو و نما یافتہ) ملا افلاکی۔

ذیل میں چند شعراء کے حالات زندگی درج کیے جاتے ہیں۔

ورق ۷۷ الف۔ 'ملا محمد کشمیری۔ از فحول علماء و صلحاء بود۔ طبعش جامع فنون و آداب را

قانون باعتقاد بعضی سرآمد فضلاء بود۔ در اصفهان سکنی داشت۔ بسبب سرکشی و عناد طبع بیدخوبی شہرت کردہ دریں سال فوت شد۔ گاہے رباعی می گفت۔ ازاں ایں است۔

اے گل کہ نہ بوئے از تو پیدا و نہ رنگ — وز شوق جمال تو بود ہر آہنگ

دورم از تو بسان ظلمت از نور — ہستی در من میان آتش و سنگ

مرزا معتز۔ خلف میرزا الفخرا کہ از سادات موسوی قسم است۔ و از جانب والدہ صبیہ زادۂ السید السادات میر محمد زمان مشہدی۔ جوان قابل فاضلی است، بصفت حسنہ آراستہ، در تحصیل علوم سلیقہ اش در کمال رسائی و ذہنش در نہایت خوش ادائی۔ از مشہد مقدس باصفہان آمدہ۔ مدت دو سال در مدرسہ جدہ سکنی نمودہ در خدمت علامی آقا حسین تحصیل مشغول بود۔ چوں دریں ولایت فضیلت و نجابت قدرے نہ دارد، یک سال قبل از حالت تحریر روانۂ ہندوستان شد۔

میرزا شاہ تقی، واعظ۔ اسم شریفش میرزا رفیع است۔ نوادۂ ملا فتح اللہ واعظ قزوین است، بفنون کمالات آراستہ و بصلاح و پرہیزگاری پیراستہ، چمن طبعش را آفتاب گل خودرو و گلزار خاطرش را ماہ تمام گل شب بود۔ و لطافت و ملاحت طبع اورا تالیف مسمی بابواب الجنان ہشت گواہ عادل است کہ چہار عددش بہ محکۂ عدل صاحبان انصاف گذشتہ و کل فصاحتش باذعان مفتون گردیدہ۔ حقا کہ ہر بابش در بہشت بروی۔ مطالعہ کنندگان کشید و ہر فقرہ اش از راہ نظر بہ بیندہ رحیق نماید۔ غرض کہ جلد اول ایں کتاب فصاحت آیات بنظر فقیر رسیدہ۔ ایں کس را از کسب احادیث و اخلاق مستغنی می سازد۔ چرا کہ فقیر مطالعہ کتب و تواریخ و اخلاق و امثال آں بسیار نمودہ۔ بحسب لفظ و معنی ہیچ کدام ایں قدر رساں نیست۔ کمینہ حیرانم کہ در مجلدات دیگر چہ خواہد گفت کہ دراں نباشد۔ امید کہ بصحت و عافیت و سلامت بود۔

میرزا ملک گویا خراسانی مشرقی تخلص از شرق طبعش معانی رنگین و سخناں بہ جہت آئین ہمچو آفتاب طالع۔ اگر چہ در عداد شعراء بود۔ اما در کمال نزاکت و بلند پردازی بود۔ چنانچہ در لباس تکلف بسیار می کردہ۔ وضع آدمیانہ بزرگانہ داشت۔ ملازمان و غلامان صاحب حسن مقطع در خدمت او بودند۔ مدتے در خدمت عالی جاہ حسن خان حاکم ہرات بود۔ خان از صحبت محظوظ بود۔ مشار الیہ کہ باصفہان آمد۔ خان غزلی در مفارقت او گفتہ۔

---

(۴) تذکرہ کرم امام۔ (غیر مطبوعہ)

یہ تذکرہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور اس میں ہندوستانی فارسی شعرا کے حالات مندرج ہیں۔ تذکرہ ضخیم ہے اور صاحب تذکرہ نے اپنے کو شاگرد خان آرزو لکھا ہے۔ تذکرہ ۱۲۸۱ء میں نقل کیا گیا ہے۔ صفحہ ۹۱ پر محمد یوسف تخلص یوسف کے ترجمہ میں مولف تذکرہ لکھتا ہے کہ

'فقیر کرم گوید کہ خان ارزو احوال یوسف نہ نوشتہ، ہمیں مدر اشعارش در تذکرۂ خود نگاشتہ بود۔ من دیوانش را دیدم، مصاحب علی وز 'ندنی او شکے نیست'۔

صفحہ ۹۷ میں مولف اپنا نام یوں لکھتا ہے کہ 'عاصی محمد کرم امام گوید'۔

صفحہ ۲۲۵ پر آزاد بلگرامی کے ترجمے میں اپنی تصنیف 'اتحاف السلا' کا نام لکھا ہے۔ بقول صاحب تذکرہ آزاد بلگرامی ۱۱۱۶ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔

صفحہ ۲۴۷ میں لکھا ہے کہ کرم امام خان آرزو کے شاگرد تھے۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ (کرم امام) ۱۲۳۲ ہجری میں بنارس گئے۔ وہاں شیخ علی حزین کی قبر کی زیارت کی اور تاریخ وفات بھی کہی تھی۔ مادۂ تاریخ یہ ہے۔

ع 'وا نکہ دراز کرد دو گیسوئے مشکبار'

۱۱۸۰ ہجری

تذکرۂ کرم امام بہت مفید ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ بہت سے ہندوستانی فارسی شعر کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ کتاب میں بعض اوراق کی شیرازہ بندی غلط ہے۔ ترقیمے میں ۱۲۸۱ ہجری سال کی کتابت درج ہے۔

Hamadania Colony
Bimna, Srinagar-190 018

ڈاکٹر سید حسن عباس
شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی،
وارانسی-۲۲۱۰۰۵

گلشنِ فارس

علامہ جمیل مظہری کی ایک نایاب فارسی تالیف

علامہ جمیل مظہری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر میں کئی یادگاریں چھوڑیں ہیں جن میں 'نقشِ جمیل'، 'فکرِ جمیل'، 'عرفانِ جمیل'، 'مثنوی آب و سراب'، 'مثنوی جہنم سے' اور 'وجدانِ جمیل' نظم میں اور 'فرض کی قربان گاہ پر' یا 'فتح و شکست' نثر میں، ان کی زندگی میں ہی شائع ہو چکی تھیں۔ بعد میں ان کی کچھ اور چیزیں بھی شائع ہوئیں جن میں 'آثارِ جمیل'، (پٹنہ ۱۹۸۸ء)، جمیل مظہری کے مرثیے (کراچی ۱۹۸۸ء)، فریاد جوابِ فریاد (کراچی ۱۹۸۹ء)، منثوراتِ جمیل مظہری (پٹنہ ۱۹۹۱ء، ۲ جلدیں)، افسانہ 'تحفۂ رونمائی' (پٹنہ ۱۹۹۲ء) اور جمیل مظہری کے کچھ قطعاتِ تاریخِ وفات، تہنیتی نظمیں اور سہرے وغیرہ ایک مختصر سے مجموعے میں شائع ہو چکے ہیں۔ جمیل مظہری کی شخصیت اور فن پر بہت سے لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ماہنامہ سہیل گیا (۱۹۶۰ء) اور ادبی کائنات (۱۹۸۲ء) نیز ماہنامہ آجکل دہلی نے جمیل مظہری کے سلسلے میں خصوصی شمارے شائع کیے جن میں کائنات کا جمیل مظہری نمبر بڑا وقیع اور بھاری بھر کم ہے۔ افسوس کہ کتابت و طباعت شایانِ شان نہ ہونے کی وجہ سے ادبی حلقے میں اس خاص نمبر کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کا یہ مستحق تھا۔ رسالے کے اربابِ اختیار اگر اس نمبر کے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر دیں تو اس سے استفادے کی راہ آسان ہو جائے گی۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر ثریا جمال مظہری کی ایک کتاب 'جمیل مظہری - کچھ یادیں، کچھ باتیں' شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بھی دوسری کتابوں کی طرح 'گلشنِ فارس' کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ پر کام کرنے والوں کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری، ورنہ ان کے کارناموں کی فہرست میں اس کتاب کا نام ضرور درج ہوتا۔ میں اس کتاب سے پہلے سے واقف تو تھا کیونکہ اس کا ذکر ڈاکٹر عارف نوشاہی کی تالیف 'فہرست کتابہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتابخانۂ گنج بخش جلد ا، ص ۵۰۰ پر دیکھا تھا لیکن خود نہ تو یہ کتاب کہیں نظر سے گذری اور نہ ہی علامہ کے حوالے سے انجام پانے والے علمی کاموں میں اس کا تذکرہ ملا۔ لیکن بنارس ہندو یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں دورانِ مطالعہ یہ کتاب ہاتھ آگئی۔ کتاب کا پورا نام 'گلشنِ فارس مع فرہنگ' ہے اور مرتب کا نام سید کاظم علی کاظمی ایم-اے المعروف بہ جمیل مظہری، کتاب کے سرورق پر درج ہے۔ یہ کتاب صوبۂ بنگال کے مدارس

کے سینیر سال دوم کے طلبا کے لیے تیار کی گئی تھی جسے شمس العلما مولوی محمد ہدایت حسین صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ اور رجسٹرار بورڈ آف سنٹرل اکزامینیشنز مدارس بنگال نے پورے صوبے کے مدارس کے لئے منظور کیا تھا۔ یہ ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۱ء کی تالیف ہے۔ علامہ جمیل مظہری نے اسے اپنی عمر کے ۲۶ویں یا ۲۷ویں سال میں تالیف کی ہوگا۔ اور یہ اسی سال یعنی ۱۳۵۱ھ میں ہی ۱۳۸ + ۸ صفحات میں وحیدی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب کا سرورق رنگین ہے۔ سرورق کی عبارت یوں ہے

جملہ حقوق بحق مطبع محفوظ ہیں

گلشن فارس مع فرہنگ ۱۳۵۱ھ

مرتبہ

جناب مولوی سید کاظم علی صاحب کاظمی ایم۔اے

(المعروف بہ جمیل مظہری)

مقررو منظور فرمودۂ

عالیجناب شمس العلماء خان بہادر مولانا مولوی محمد ہدایت حسین صاحب

پی ایچ ڈی۔ ایف۔اے۔ایس۔بی۔ایم۔آر۔اے۔ایس

پرنسپل مدرسۃ العالیہ کلکتہ ورجسٹرار بورڈ آف سنٹرل اکزامینیشنز مدارس بنگال

برائے نصاب

سینیر سال دوم امتحان مدارس صوبۂ بنگالہ

مطبوعہ وحیدی پریس کانپور

اس کتاب پر ایک مہر ثبت ہے جو بہت ہلکی ہو چکی ہے لیکن کوشش کر کے پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ غالباً انٹر میڈیٹ بورڈ لائبریری الہ آباد کی مہر ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بورڈ لائبریری الہ آباد میں ۳۱/۷/۱۹۳۲ء کو داخل ہوئی تھی۔ قیمت غالباً ۱۲ آنہ تھی۔ سرورق اور فہرست مضامین والے صفحے پر اوپر کی طرف ہندی میں ایک ایک مہر لگی ہوئی ہے۔ مہر کی عبارت یہ ہے "مہیش پرساد مولوی عالم فاضل"۔ یہ مشہور مولوی مہیش پرساد ہیں جو شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد اور غالب شناس کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سنٹرل لائبریری میں اس کا نمبر اندراج 63049 ہے۔ فہرست مضامین کے بعد والے صفحے پر مرتب کی طرف سے پروفیسر محمد طاہر رضوی کا اس تالیف میں مدد کرنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت یوں ہے

شکریہ

سعی ہائے آقائے پروفیسر محمد طاہر رضوی (پریسیڈنسی کالج

کلکتہ) را بسیار متشکرم کہ در ترتیب این تالیف محقرہ عاریت

فرمودند۔

جمیل مظہری

کتاب بغیر مقدمہ کے ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ نثر میں درج ذیل انتخابات شامل ہیں۔

انتخاب از سفر نامۂ ناصر الدین شاہ قاچار۔ انتخاب از چنگیز خان نامہ۔

پارسیان اہل کتابند۔ جشن نوروز۔ انتخاب از انشائے قائم مقام۔

مکتوبات فارسی۔ سرگذشت مسرس ہورکسلت۔ انتخاب از تاریخ ایران۔

انتخاب از تاریخ ساسانیان۔

حصۂ نظم - انتخاب از کلیات سعدی شیرازی۔ انتخاب از غزلیات عرفی شیرازی۔

انتخاب از کلام وفائی اور ترکیب بند مرزا غالب دہلوی پر مشتمل ہے۔

اس کتاب پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ جمیل مظہری نے اس درسی نوعیت کی کتاب میں جو انتخابات شامل کیے ہیں وہ مبتدیوں کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس مطبوعہ کتاب کے منظر عام پر آنے سے علامہ جمیل مظہری کی ادبی کائنات میں ایک کتاب کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ شاید یہ کتاب ان کی اولین ادبی کاوش ہو۔

❁
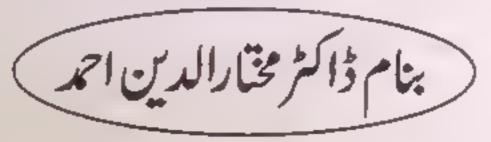
ڈاکٹر عبدالسلام
سنٹرل آفس
بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی۔ ۲۲۱۰۰۵

ایران صدیوں کے آئینے میں

ایک تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر امرت لعل عشرت (۱۹۳۰-۱۹۸۹ء) ایک مایۂ ناز ادیب اور صاحب ذوق شاعر تھے۔ فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ تاریخ سے بھی انھیں بڑا شغف تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ مدرس تھے۔ ان کا آبائی وطن لاہور تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان شملہ میں آکر بس گیا۔ وہاں عشرت صاحب درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، فارسی اور عربی میں بحیثیت استاد خدمت انجام دی۔ یہ شعبے الگ ہوئے تو شعبہ فارسی سے وابستہ ہو گئے۔ چوں کہ وہ اعلی استعداد اور فکر رسا کے مالک تھے اس لئے ان میں ہمیشہ کچھ نیا کارنامہ انجام دینے کا جذبہ موجزن رہتا تھا اور ان کے اسی جذبے نے ان کو ہمیشہ قلم و قرطاس سے جوڑے رکھا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ادبی دنیا متعدد شہ پاروں سے روشناس ہوئی۔

'ایران صدیوں کے آئینے میں' عشرت صاحب کی وہ مایۂ ناز تصنیف ہے جو فارسی دنیا کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان و ادبیات کے آغاز و ارتقاء سے لے کر عہد جدید تک کے ادبی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی احوال و کوائف کے ساتھ فنون لطیفہ نیز صنعت و حرفت کی دل چسپ اور مفید معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ طوالت سے قطع نظر ان کی اس بہتم بالشان کتاب کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

'ایران صدیوں کے آئینے میں' کی پہلی اشاعت ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ ۴۴۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب علمی الیکٹرک مشین پریس، تکیا نالہ، وارانسی سے طباعت پذیر ہوئی۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ سرورق کے کاغذ کا رنگ گہرا بادامی ہے۔ اس کے فلیپ پر پروفیسر سید احتشام حسین کا تبصرہ چھپا ہے۔ کتاب کے پچھلے فلیپ پر فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اختر اورینوی کے تبصرہ چھپے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن ۱۹ سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۸۶ء میں بھارگو بھوشن پریس وارانسی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ دوسرے ایڈیشن کی کتابت جاذب نظر، طباعت دیدہ زیب، سرورق دلکش اور کاغذ معیاری ہے۔ ۴۵۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا سائز 5½ x 8½ انچ ہے۔ دوسرا ایڈیشن مالک رام، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر جوگندر سنگھ، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر حفیظ بنارسی اور ایڈیٹر ماہ نامہ معارف اعظم گڈھ کے تبصروں کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ فراق گورکھپوری کا تبصرہ اس نئے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے۔ راقم سطور کے پیش نظر یہی دوسرا

ایڈیشن ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے پہلے صفحہ پر کتاب کا نام، مصنف کا نام اور سنِ اشاعت درج ہے۔ دوسرے صفحے پر انتساب کے یہ کلمات لکھے ہیں :

'خانم عشرتؔ کے نام جو ایران میں بھی ہم سفر تھیں، اور زندگی میں بھی ہم سفر ہیں'۔

تیسرے صفحہ پر بار اشاعت چاپ دوم، ناشر کا نام ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، پروفیسر وصدر شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس-۵، کتاب کی قیمت اور پریس کا نام چھپا ہوا ہے۔ چوتھے صفحہ پر 'سفینہ جب کنارے پر' کے عنوان سے عشرتؔ صاحب نے دوسرے ایڈیشن کی غرض اشاعت مختصراً بیان کی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

'اس کتاب کو اہلِ علم نے بہت پسند کیا۔ اس لئے دوسری دفعہ چھاپنے کی ہمت ہوئی'۔

پانچویں اور چھٹے صفحے پر عشرتؔ صاحب نے 'گزارش احوال' کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کتاب ان کے سفر ایران کی یادگار ہے۔ ۱۹۶۲ء کے موسم بہار میں شیراز کی یک پرلطف صحبت میں جناب آقای علی اصغر حکمت (سابق سفیر ایران در ہند) نے اپنی مشہور تصنیف 'سرزمین ہند' انھیں عنایت فرمائی تھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر زیرِ نظر کتاب کی تالیف کا انھیں خیال آیا۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ انھوں نے قدیم وجدید ایران کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے مزید لکھا ہے کہ یہ کتاب ڈھائی ہزار سالہ ایرانی کلچر کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاسی، اجتماعی، معاشی، دینی، لسانی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک جانبدارانہ جائزہ ہے۔

ساتویں صفحے پر عشرتؔ صاحب کا پوسٹ کارڈ سائز کا یک بڑا رنگین اور جاذب نظر فوٹو چھپا ہے۔ اس کے نیچے انگریزی میں Author لکھا ہے۔ فوٹو کے بائیں طرف Photograph by KIRMANI چھپا ہے۔

اس کتاب کے مشتملات کی فہرست حسب ذیل ہے

زیر نظر کتاب کے تعارف میں قدیم، جدید ایرانی تاریخ و کلچر کے مختلف پہلوؤں اور ادبی سرگرمیوں کا
جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف بیک وقت اردو و فارسی کے جید عالم، ادیب، مورخ اور انشاء پرداز ہونے کے ساتھ

بہترین ایران شناس بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اس کتاب کے قالب میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کی چند خاص خوبیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) اس کتاب کی پہلی خوبی یہ ہے کہ جن موضوعات پر یہ کتاب لکھی گئی ہے ان پر اردو زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں اور جو لکھی بھی گئی ہیں وہ کئی اعتبار سے اس سے کم درجہ ہیں اس لئے یہ انفرادیت پُر از معلومات مواد اور دلچسپ بیانات کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے مشہور محقق و ادیب مالک رام کا ارشاد ہے :

> 'انھوں نے (عشرت صاحب نے) عہد بہ عہد کی ادبی، لسانی، مذہبی، فنی سرگرمیوں اور تحریکوں سے شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے ایران جدید کے مختلف پہلوؤں پر جس دیدہ وری اور تفصیل سے لکھا ہے وہ اس سے پہلے اردو میں موجود نہیں تھا'۔ [۱]

پروفیسر نذیر احمد، سابق صدر شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ زیر نظر کتاب کی اہمیت اور افادیت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :

> 'یہ اہم کتاب اسم با مسمیٰ اور ہندوستانی یونیورسٹیوں اور طلبہ کی اہم ضرورت کی کفیل ہے'۔ [۲]

پروفیسر جوگیندر سنگھ سابق اسسٹنٹ ڈائریکٹر، الف، پنجاب نے اس کتاب کی انفرادیت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

> 'ایران صدیوں کے آئینے میں' اپنی قسم کی منفرد کتاب ہے جس کا اسٹائل پروفیسر براؤن کی لٹریری ہسٹری والا رکھا گیا ہے، اور جو بہت اچھا ہے'۔ [۳]

معروف علمی و تحقیقی ماہ نامہ 'معارف' اعظم گڑھ نے اپنے تبصرے میں اس کتاب کی انفرادی حیثیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے :

> 'ایرانی ادبیات و شاعری سے قطع نظر ابھی تک اردو میں ایران کے متعلق کم کتابیں لکھی گئی ہیں'۔ [۴]

(۲) اس کتاب کی دوسری خوبی ایجاز و اختصار ہے۔ مختلف نوعیت کے موضوعات و عنوانات کو سلیقہ مندی

---

[۱] آل انڈیا ریڈیو، دہلی کا نشریہ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۷۹ء بحوالہ 'ایران صدیوں کے آئینے میں' از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۹

[۲] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۲

[۳] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۳

[۴] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۴

کے ساتھ ایک ہی جلد میں سمیٹا گیا ہے۔ یہ کام بہت مشکل اور تفصیل طلب تھا لیکن مصنف نے صدیوں کی سرگذشت کو ایک ہی جلد میں توازن اور اعتدال کے ساتھ یکجا کر کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا کام کیا ہے۔ یہ کتاب نہ تو اتنی مختصر ہے کہ قاری کو تسلی وتشفی نہ ملے اور تشنگی کا احساس باقی رہے اور نہ ہی اس قدر طویل اور ضخیم ہے کہ یہ واقعات و حادثات کا پلندہ بن کر رہ جائے۔ تمام ضروری اور دلچسپ واقعات اور ان کے اجزاء لے لئے گئے ہیں اور غیر ضروری جزئیات وتفصیلات چھوڑ دیے گئے ہیں۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی، سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی رقم طراز ہیں :

'اس میں ایران کی ساری سیاسی ادبی اور ثقافتی تاریخ بیان کی گئی ہے لیکن یہ کام بہت بڑا تھا، اس لئے اختصار سے کام لینے کی ضرورت پڑی۔ ظاہر ہے کہ صدیوں کی تاریخ اگر سوا چار سو صفحات میں بیان کی جائے تو وہ مختصر ہی ہوگی اور جب کہ مؤلف اس تاریخ کے ساتھ ادبیات اور تمدنی حالات کو بھی بیان کرنا چاہے لیکن باوجود مختصر ہونے کے ڈاکٹر عشرت صاحب نے مفید مطلب باتیں سب کہہ دی ہیں، اور بہ مقابلہ ان چند کتابوں کے جو اس کے پیشتر اردو میں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں، اس میں زیادہ معلومات فراہم ہوتی ہیں'۔ [1]

(۳) مصنف نے عہد قدیم کے ایران کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا ہے اور عہد جدید کا بھی۔ ابواب تاریخی بنا پر زمانے کی مناسبت سے تقسیم کئے گئے ہیں۔ مخصوص زمانے کے تحت ایران کی تاریخ کے علاوہ ثقافتی، معاشرتی، مذہبی، ادبی، لسانی غرض یہ کہ تمام پہلوؤں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ مالک رام نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار ان کلمات سے کیا ہے ۔

'ان کے پیش نظر ایران کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ تفصیل سے بیان کرنا تھا اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں'۔ [2]

پروفیسر سید احتشام حسین نے اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے

'یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایران کی تہذیبی تاریخ خود ہماری تاریخ کا ایک پہلو ہے جو کم سے کم تین صدیوں پر محیط ہے اسے سمجھنا اور اس کی مدد سے ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب پر نگاہ ڈالنا مفید نتائج برآمد کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر عشرت نے مختصر جگہ میں (لیکن ایسی مختصر بھی نہیں) ایران کے تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور ادبی ارتقاء کا دلکش اور روشن

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۶

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۹

خاکہ پیش کیا ہے'۔ ؎۱

(۴) عشرت صاحب کا تاریخی شعور خاصا بالیدہ تھا۔ انھوں نے قدیم و جدید ہندوستانی تاریخ کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا اور مشرقی و مغربی تاریخ کا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیانات اور مباحث پر کیف اور جاندار ہوتے ہیں۔ ان کا انداز بیان اتنا نرالا ہے کہ جس زمانے اور ماحول کا وہ ذکر کرتے ہیں قاری اپنے کو اسی زمانے اور ماحول کا فرد محسوس کرنے لگتا ہے۔ تاریخی واقعات میں انھوں نے عہد بہ عہد حکومتوں کے قیام و زوال، جنگ و جدل، فتح و شکست، خاندانی نظام و آپسی رقابت، سیاسی و اقتصادی حالات کے تمام پہلوؤں کا مختصر مگر جامع خاکہ کھینچا ہے۔ تاریخی واقعات کے ساتھ مصنف نے ایران کے جغرافیائی، طبعی اور قدرتی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب کا آغاز لفظ ایران کے مادہ اشتقاق سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

'ایران یا 'اران'، 'ایریا 'ار' کی جمع ہے اور یہ لفظ 'آریہ' سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب سنسکرت اور اوستا میں آزاد اور پاک نژاد ہے۔ ایران کے قدیم نام 'ایران کشیتر' اور 'ایران شہر' ہے اور یہ دونوں نام ہخ منشی کتبوں اور پہلوی تصنیفات میں ہر جگہ ملتے ہیں'۔ ؎۲

ایران کے جغرافیائی، طبعی اور قدرتی حالات کے بیان کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں

'ایرانی سطح مرتفع کو شمال میں دریائے مازندران اور جنوب میں خلیج فارس نے محصور کر رکھا ہے۔ خلیج فارس دنیا کے گرم ترین حصوں میں سے ایک ہے اور جزیرہ نمائے عربستان کو ایران سے جدا کرتی ہے۔ ایران کو سمندری رستوں سے دنیا کے ساتھ متصل کرنے میں خلیج فارس کی اہمیت مسلم ہے۔ اسی طرح ایران کے بری راستے مشرقی اور مغربی ایشیا کو ملانے کے لئے ہمیشہ ایک پل کا کام کرتے رہے ہیں'۔ ؎۳

(۵) تاریخی واقعات کے علاوہ مصنف نے ہر دور کے ثقافتی، معاشرتی، اقتصادی، علمی، ادبی، لسانی حالات وانقلابات، فنون لطیفہ، مصوری اور تعمیراتی کاموں کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے مذہبیات کے ضمن میں مذہبی تعلیمات، تغیرات، رسم و رواج و مذہبی پیشواؤں کا ذکر بہت اچھے ڈھنگ سے کیا ہے۔ سماجی حالات کے تحت سماج کی طبقہ بندی، رسومات و عادات، لباس، طرز معاشرت، عورت کا مقام، کھیل کود، سیر و شکار، شہ سواری، تیر اندازی، چوگان بازی کے علاوہ زراعت، شجر کاری، تجارت وغیرہ کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔

؎۱ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۱

؎۲ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱

؎۳ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲

ان عنوانات کے علاوہ زبان و ادب سے تفصیلی گفتگو بھی کی گئی ہے۔ ہر دور کی مختلف زبانوں، ان کے لہجوں، ادیبوں اور شاعروں کے مختصر تعارف اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔

(۶) اس میں دیانت داری اور غیر جانب داری کے علاوہ تحقیق اور منطقی استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی رائے قائم کرتے وقت نہ صرف یہ کہ پوری دیانت داری سے کام لیا ہے بلکہ اسے تحقیق کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

'لائق مصنف نے محنت و تحقیق اور غیر جانب داری کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے'۔ [۱]

پروفیسر حفیظ بنارسی عشرتؔ صاحب کی تحقیقی دیانت داری پر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

'زیر نظر کتاب میں جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، قابل مصنف نے ڈھائی ہزار سال کے طویل عرصہ میں پھیلی ہوئی ایرانی زندگی اور تمدن کی فنکارانہ عکاسی کی ہے۔ اس عظیم ملک کی سیاسی، سماجی، دینی، لسانی، فنی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر انھیں نہایت دل پذیر انداز میں پوری تحقیقی دیانت داری اور ادبی غیر جانب داری کے ساتھ پیش کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے اور اس مشکل کام میں بہت بڑی حد تک ظفریاب ہوئے ہیں'۔ [۲]

اس سلسلے میں متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایران کے مذہبی رہنما زرتشت کا زمانہ اور ان کے مقام ظہور کے بارے میں مصنف کی تحقیق کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں

'عالموں اور محققوں کی ایک طویل بحث کے باوجود ابھی تک زرتشت کے زمانے اور مقام ظہور کے بارے میں ہم کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ عام طور پر اس پیغمبر کے ظہور کے سلسلے میں تین نظریات پیش کئے جارہے ہیں۔ اول یہ کہ زرتشت مغربی ایران میں پیدا ہوا۔ دوم یہ نظریہ کہ اس کا ظہور مشرقی ایران میں ہوا۔ تیسری صف میں وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مغربی ایران میں متولد ہوا۔ لیکن اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے اس کی زندگی کا بیشتر حصہ مشرقی ایران میں گزرا۔ یونانی اور رومی مورخوں کے متناقض اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ زرتشت کے جنم کے بارے میں قدیم ایران میں بھی کوئی مستند روایت نہیں ملتی تھی۔ گاتھا جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے اور عموماً خود زرتشت کی تصنیف خیال کی جاتی ہے، میں بھی زرتشت اور اس کے منطقہ تبلیغ

---

[۱] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۵

[۲] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۹

کے بارے میں کوئی صریح اشارے نہیں ملتے'۔ [1]

اسی طرح زرتشت کے سال ولادت کے بارے میں مصنف نے تحقیق کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے

'خود زرتشتیوں کی روایت کے مطابق زرتشت کا سال تولد لگ بھگ ۶۶۵ ق۔م ہے۔ لیکن یہ تاریخ بھی ظاہراً درست معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ ہیروڈوٹس نے جو اس اندازے کے مطابق پیغمبر سے تقریباً ایک سو سال بعد ہوا ہے زرتشت کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کر رکھا ہے۔ اس نے چار بادشاہوں کا حال لکھتے وقت اس ایرانی پیغمبر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اس پیغمبر کو قدیم سمجھتا تھا۔ زمانہ حال کے محقق بہت سے دلائل اور تحقیق کے بعد زرتشت کے زمانے کو لگ بھگ ۱۱۰۰ ق۔م سمجھنے پر مجبور ہیں اور طوالتِ کلام سے گریز کرتے ہوئے ہم بھی یہاں اسی تاریخ پر اکتفا کریں گے'۔ [2]

عشرت صاحب نے تحقیق و تدوین کے پیرائے میں بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کے اس بیان کو قابل اعتماد تسلیم نہیں کیا ہے کہ ایرانی مذاہب میں انسانی مردوں کو درندوں اور پرندوں کے سامنے ڈال دینا بہتر سمجھا جاتا تھا۔ عشرت صاحب نے منطقی استدلال کے ساتھ مندرجہ بالا خیالات کی تردید ان الفاظ میں کی ہے۔

'یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہان ہخامنشی کے مقبرے کس اصول کے تحت تعمیر کیے گئے ہیں۔ داریوش سوم کی ملکہ کو خود بادشاہ کے سامنے دفن کیا گیا اور اسکندر نے داریوش کی نعش کو فارس بھیجا تاکہ اسے شاہوں کے مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اس سوال کا جواب مناسب ثبوت نہ ہونے کے سبب غالباً بہت مشکل ہے'۔ [3]

تاریخ نگاری میں مصنف نے قدیم و جدید دونوں خیالات و نظریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

'آریوں کے ایران میں وارد ہونے کے بارے میں پہلے مورخوں کا نظریہ یہ تھا کہ یہ لوگ لگ بھگ دو ہزار سال قبل از مسیح میں یہاں آئے لیکن جدید خیال یہ ہے کہ یہ ہجرت چودہویں صدی ق م سے لے کر آٹھویں صدی ق۔م تک مسلسل ہوتی رہی'۔ [4]

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۹

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۴۲

[3] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳۹

[4] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳

(۷) ایرانی ادبیات پر بھی مصنف نے دقت نظر سے کام لیا ہے۔ محققانہ استدلال بروئے کار لاتے ہوئے مختلف عہد کی زبانوں، ذیلی عنوانات کے تحت ان کے لہجوں، وجہ تسمیہ، رسم الخط، حروف تہجی وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ فارسی زبان کے تینوں اسلوب سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی کے امتیازات وخصوصیات کو اس طرح سے برتا ہے کہ مبتدی ان کے درمیان کے فرق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اوستائی اور ہخامنشی زبانوں کا ذکر بڑا دلچسپ اور اہم ہے۔ توضیح کی خاطر ان دونوں زبانوں کے سنسکرت، فارسی جدید اور اردو کے الفاظ کی طویل فہرست پیش کی گئی ہے۔ ان دونوں ایرانی زبانوں کے کچھ اشلوک بھی نقل کیے گئے ہیں۔ ان فہرستوں اور اشلوکوں سے مصنف نے ان زبانوں کی سنسکرت سے مشابہت اور مماثلت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سنسکرت سے مشابہت سے متعلق ذیل کا اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا :

> 'موجودہ اوستا جدید زبان شناسوں اور محققوں کے لیے قدیم ترین ادبی متن ہے۔ اس کے بہت سے قطعات ہمارے 'ویدوں' کے قطعات سے بے حد ملتے جلتے ہیں۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان سنسکرت کی سگی بہن ہے۔ الفاظ اور گرامر کے لحاظ سے اوستائی اور سنسکرت میں اس قدر مشابہت ہے کہ سنسکرت کا ایک وددان متن اوستا کو بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ سنسکرت کے مانند اوستائی بھی آٹھ حالتوں والی زبان ہے۔ یعنی اس کے اسم فعل آٹھ مختلف صورتوں میں صرف کیے جاتے ہیں۔ مفرد و جمع اور تذکیر و تانیث میں بھی یہ سنسکرت کی مقلد ہے'۔ [۱]

(۸) مصنف نے غیر جانبدارانہ طور پر ایرانی، ادبی عصبیت کے خلاف مظاہرہ کیا ہے۔ ہندوستانی فارسی شعرا یا ایران سے ہندوستان میں ہجرت کر کے آئے ہوئے فارسی شعرا و ادبا، ان کے کلام و نگارشات اور ہندوستانی فارسی اسلوب 'سبک ہندی' کے تئیں ایرانیوں میں جو بے التفاتی کے رجحانات پائے جاتے ہیں ان کے خلاف مصنف نے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان کی مقبولیت اور اس کی قدر و منزلت بڑھانے میں ہندوستانیوں کے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے حوالے سے عشرت صاحب رقم طراز ہیں

> 'ایشیائے کوچک سے زیادہ فارسی کی قدر و منزلت ہندوستان میں ہوئی۔ ہم پہلے یہاں بیان کر چکے ہیں کہ فارسی غزنیوں اور غوریوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئی تھی اور تھوڑی ہی مدت میں یہاں سرکاری، دینی اور ادبی حیثیت سے بہت اہمیت

---

[۱] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر اہرت نعل عشرت، ص ۶۱

حاصل کر چکی تھی۔ منگولی حملے کے گیرودار میں شاعروں، ادیبوں، عالموں اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ ساتھ عوام کے مختلف طبقوں کی ایران سے ہندوستان کی طرف ہجرت نے اس زبان کے قدم اور بھی مضبوط کر دیے اور رفتہ رفتہ اسے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل ہو گیا جو اس سے پہلے اپبھرش پراکرت اور سنسکرت کو مل چکا تھا۔' [1]

عشرت صاحب نے ایرانیوں کی لسانی عصبیت اور بے التفاتی پر ضرب کاری یوں لگائی ہے۔

'دوسروں کی بات چھوڑیے خود ایران سے جو شعرا ہندوستان گئے انھیں بھی (ایک آدھ کو چھوڑ کر) درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ لوگ ایک مدت تک ہندوستان میں رہنے کے سبب معتوب قرار دیے گئے ہیں۔ بہترین مثالوں کے طور پر عرفی شیرازی، طالب آملی، سلیم تہرانی، کلیم کاشانی اور قدسی مشہدی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ صائب تبریزی کو غالباً اس لیے مستثنیٰ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ آخری عمر میں ہندوستان ترک کر کے ایرانی دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔' [2]

جدید ایرانیوں کے تعصب اور بے اعتنائی کے متعلق عشرت صاحب فرماتے ہیں

'اپنی زبان کے تحفظ کے لیے ایرانیوں نے ہمیشہ انتہائی تعصب سے کام لیا ہے۔ عربوں کے تسلط کے بعد اگرچہ فارسی نے عربی سے گہرے مراسم قائم کر لیے ہیں لیکن ایرانی دانشمند ہمیشہ اپنی زبان کے ملکی مزاج کو قائم رکھنے کے لئے اس ملمع کو اتار پھینکنے کی کوشش میں مضطرب رہے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں تشکیل یافتہ 'فرہنگستان' نے اس کام کو بہت تیزی سے انجام دیا ہے۔ اس انجمن نے اعلان کیا کہ فارسی کو عربی اصطلاحات کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے الفاظ خالص فارسی میں موجود ہیں۔ یہ تھوڑی سی محنت سے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ انجمن کی طرف سے بہت سی کتابیں اس موضوع پر شائع کی گئی ہیں۔' [3]

(۹) ایرانیوں میں ہندوستانی فارسی ادبیات کے تئیں برتی جانے والی جانب داریوں کے ازالہ کے لئے مصنف نے اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

'حقیقت یہ ہے کہ ایرانیوں نے اپنی فطری سہل نگاری کے سبب ابھی تک 'سبک ہندی'

---

۱ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۶۴

۲ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۶۶

۳ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۸۰

کا صحیح تجزیہ ہی نہیں کیا ہے۔ اس میں بہت کچھ قصور ہندوستانیوں کا بھی ہے۔ ہمارے فارسی دانوں نے عام طور پر یہ کوشش ہی نہیں کی کہ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اہل زبان کے سامنے اچھے انداز میں پیش کریں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے فارسی ادبیات کے لئے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر ہم نے ایرانیوں سے اپنے ادبی تعلقات تقریباً تقریباً منقطع کر لیے ہیں۔ ہندوستانی فارسی تحقیقات کا انگریزی یا اردو میں ذکر ایرانیوں کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ ان کی اکثریت یہ زبانیں نہیں جانتی۔ ان کے لئے یہ معلومات فارسی یا فرانسیسی میں فراہم کی جانی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ آخر الذکر زبانیں بولنے یا لکھنے کا ہمارے ہاں کوئی تصور تک موجود نہیں ہے۔"[1]

(۱۰) مصنف نے ایران کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے وہس کتاب میں بیان کردہ واقعات، حالات کیفیات کو اپنے مشاہدے اور تجربہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور سے جدید ایران کے تذکرے میں ان کا اپنا خالص مشاہدے اور تجربے کا دخل ہے۔ انھوں نے جدید ایران کی سچی تصویر کشی کے ساتھ نئی نئی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ جو طبیعت کو تازگی اور تراوٹ بخشتی ہیں۔

پروفیسر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ چوں کہ زیرِ نظر کتاب میں ایران کے حالات چشم دید بیان کیے گئے ہیں اس لیے ان میں دلچسپی کے عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔[2]

اس سلسلے میں پروفیسر حفیظ بنارسی فرماتے ہیں

'انھوں نے تحصیل علم کے شوق میں اپنی عمرِ عزیز کا، ہم ذور حافظ اور خیام کی سرزمین، ایران میں گزارا ہے اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ چنانچہ ان کی تصنیف اس موضوع پر لکھی گئی دوسرے مصنفوں کی کتابوں کے مقابلے میں کئی جہتوں سے ممتاز و منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ کتاب میں بہت سی باتیں ایسی ہیں اور اس باوثوق اور پر اعتماد طور پر کہی گئی ہیں جو وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے اس سلسلے میں نہایت محنت اور جاں فشانی کی ہو۔

ع: شنیدہ کے بود مانند دیدہ!

عشرت صاحب نے محض سنی سنائی باتوں کو نہیں دہرایا بلکہ آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کیا

---

[1]

[2]

ہے جس کے باعث کتاب میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔' [1]

(۱۱) مصنف نے نہ صرف یہ کہ اس کتاب کی تالیف میں مختلف ماخذ سے استفادہ کیا ہے بلکہ ایران کے مختلف مقامات کا بہ چشم خود مشاہدہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے تصاویر، سکے، کتبے، مزار و مقبرے اور آثار قدیمہ وغیرہ کا بغور معائنہ اور مطالعہ کیا ہے اور تاریخی واقعات کو سمجھنے اور پرکھنے میں ان سے مدد لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیف امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

'ہخامنشی تعمیرات میں سب سے بڑی خصوصیت جو دیکھنے والوں کو فوراً محسوس ہوتی ہے وہ تمام عمارتوں کے اسلوب کی یکسانیت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمارت یا مقبرہ بنایا گیا تھا اور بعد ازاں ساری عمارتیں اور سارے مقبرے انھیں کی کاربن کاپی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عمارتیں ایک ہی انجینئر کی نگرانی میں تیار کی گئی ہیں اس لیے ان میں یکسانیت کا ہونا قدرتی امر ہے۔' [2]

⁂

'ایران کی پرانی تصویروں اور مجسموں سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی دوسری آریہ قوموں کی طرح روز ازل سے ہی بہت ہی خوبصورت اور خوش پوش لوگ تھے۔ ان کے قد لمبے، ناک ستواں، جسم متناسب اور رنگ گورا تھا۔ شجاعت میں بھی وہ بے مثل تھے۔' [3]

⁂

'ایران قدیم کی اکثر تصویروں میں بھی تیر و کمان دیکھنے میں آتے ہیں۔ کرمان شاہ کے نزدیک طاق بستان کے مقام پر ایک تصویر میں بادشاہ تیر و کمان سے شکارگاہ میں شکار کھیل رہا ہے۔ نقش رستم کے ایک کتبے میں دارپوش بزرگ کو 'کمان دار' کہا گیا ہے۔' [4]

⁂

(۱۲) مصنف نے ایران قدیم کے فنون لطیفہ کے بیان میں بھی ایران کے آثار قدیمہ سے استفادہ کیا ہے۔ فنون لطیفہ کے مظہر آثار قدیمہ کے معائنہ کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو

---

[1]

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۳۶

[3] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۳۹

[4] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۳۸

'قدیم ایران میں فنونِ لطیفہ کی پیش رفت کے بہترین مظہر اس زمانے کی عمارتیں، مجسمے، نقاشی، حروف، کتبے، نجاری اور مختلف قسم کے دوسرے آثارِ قدیمہ ہیں، جو آج بھی ایران کے طول و عرض میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں آثارِ پاسرگاد، آثارِ تختِ جمشید، آثارِ بے ستون، آثارِ شوش، نقشِ رستم کے کتبے، مدفن اور نقاشی وغیرہ بے حد دلچسپ ہیں'۔ ؎۱

مصنف نے ایران کے مختلف دَور کی عمارتوں اور ان کی نقاشی کا از چشم خود مشاہدہ کیا اور ان کا بیان بڑے ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے :

'صفوی دَور کی یہ عمارتیں تناسب زیبائش و آرائش اور ساخت کے لحاظ سے ایک مخصوص و منفرد اقدار کی حامل ہیں اور اس دَور کی بیشتر خوش رنگ ٹائلیں اور رنگا رنگ نقش و نگار عجیب بہار دکھلاتے ہیں۔ جا بجا سنگ مرمر پر سادہ کوفی کتبے عمارتوں کے حسن میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اکثر مقامات پر ان کتبوں کو پھولوں اور پتیوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے'۔ ؎۲

ایران کی فن نقاشی کی مقبولیت کا جواز فراہم کرتے ہوئے مصنف نے اپنے تجربات، مشاہدات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

'اس فن کی مقبولیت کا ثبوت اس زمانے کی قلمی کتابوں، دیواروں، چھتوں اور دروازوں وغیرہ پر کھینچی گئی بے شمار تصویروں کی صورت میں ہم تک پہونچا ہے۔ ان تصویروں میں بادشاہوں، امیروں، وزیروں اور درباریوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناؤ نوش کی مجلسیں، سرسبز باغات، عالی شان عمارتیں اور رنگ برنگے لباس نظر آتے ہیں۔ تصویروں کے نقوش اُجاگر کرنے کے لئے درخشاں اور مناسب رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے'۔ ؎۳

(۱۳) زیرِ نظر کتاب میں تاریخ نگاری کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کے حسین جلوے بھی نظر آتے ہیں جو ان کے گہرے مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ ان مشاہدات کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے

'حافظ کا انتقال ۱۳۸۹ء میں ہوا۔ آرام گاہ حافظ شیراز میں حافظیہ کے نام

؎۱ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر مرت لعل عشرت، ص ۴۳

؎۲ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۵۲

؎۳ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۵۷

سے مشہور ہے۔ ۱۴۵۲ء میں تیمور کے پوتے ابوالقاسم بابر نے شیراز فتح کرنے کے بعد مولانا محمد معمائی کو اس کی تزئین و آرائش کا حکم دیا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں نامور ایرانی حکمران کریم خان خان زند نے حافظیہ کی مزید توسیع کروائی اور آرام گاہ کے اردگرد بہت سے باغات لگوائے۔ استاد براؤن کی مسافرت شیراز کے وقت یعنی ۱۸۹۴ء تک شاعر کی قبر کے آس پاس بہت سی دوسری قبریں بھی موجود تھیں جو اب دکھائی نہیں دیتیں۔ حافظیہ کی جدید اور عالی شان عمارتوں اور باغوں کی تعمیر و آرائش کا مبارک کام آقای علی اصغر حکمت شیرازی کی قیادت میں نجام دیا گیا ہے۔ موجودہ آرام گاہ گویا فردوس بریں کا ایک گوشہ ہے۔ ہرے بھرے گل زاروں سے گھرے ہوئے ایوان سے گزر کر جب آرام گاہ کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں تو سنگ ریزوں کو چُن کر مرتب کیے ہوئے اس شعر پر نظر پڑتی ہے :

بر سر تربت ما چون گزری ہمت خواہ

کہ زیارت گہ رندان جہان خواہد بود [۱]

سبک ہندی کو بامِ عروج پر پہونچانے والے مشہور فارسی شاعر میرزا محمد علی صائبؔ کی قبر کا آنکھوں دیکھا حال انھیں کی زبانی سنیے :

'صائب کی آرام گاہ اصفہان شہر کے ایک کثیف اور گمنام حصے 'خیابان صائب' میں واقع ہے۔ احاطے کی دیوار کچی ہے اور ایک بدرو سے گزر کر داخل ہونا پڑتا ہے۔ صحن کا فرش خاکی ہے اور خودرو سبزے وغیرہ کی کثرت سے قبر تک پہنچنا بھی دشوار ہے۔ کہتے ہیں کہ بہت دنوں تک صائب کی قبر زیرِ زمین رہی اور ابھی حال ہی میں بہ صد دقت کشف کی گئی ہے۔ اب قبر کے اوپر شیشے کی چار دیواری بنا کر شیشے ہی کی چھت بنا دی گئی ہے۔ ہمدان میں بوعلی سینا، طوس میں فردوسی اور شیراز میں حافظ و سعدی کی عالی شان آرام گاہوں کو دیکھنے کے بعد سیاح کو صائب کی شکستہ حال قبر دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے۔' [۲]

(۱۴) جدید ایران کے مختلف پہلوؤں کا پُر کیف بیان مصنف کی آنکھوں دیکھی کمنٹری معلوم ہوتی ہے 'ایرانی بازاروں میں یورپ کا مال بہ کثرت موجود ہے۔ کپڑا ہر قسم کی مشینیں اور دیگر ساز و

---

[۱] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر عصمت لعل عشرت، ص ۲۲۱-۲۲۰

[۲] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۷۹-۲۷۸

سامان تو چھوڑیئے، تازہ امریکی انڈے اور تازہ ڈنمارک کا مکھن بھی ہر وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ یہ کھانے پینے کی بہت جلد خراب ہونے والی چیزیں ہر روز بذریعہ ہوائی جہاز وارد کی جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر اس قسم کے بورڈ نظر آتے ہیں 'چای جہان، چتوی جہان' یعنی دنیا بھر کی چائے اور دنیا بھر کے کمبل ان دکانوں میں موجود ہیں یہی حال کپڑے کا ہے۔ ہر ملک اور ہر قسم کا کپڑا آسانی سے مل جائے گا لیکن بہت زیادہ قیمت پر۔ سودے بازی کا بہت رواج ہے۔ دکاندار جس چیز کی قیمت ایک سو تومان بتائے، مشتری (خریدار، گاہک) کا فرض ہے کہ اس سے دس تومان پیش کرے۔ اب ادھر سے کمی اور اُدھر سے بیشی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کو اصطلاح عام میں 'چانہ زنی' (مول تول) کہا جاتا ہے۔ آخرکار پچیس تیس تومان میں معاملہ طے پا جاتا ہے۔ خارجیوں (غیر ملکیوں) کے ساتھ اس قسم کا سلوک عام ہے۔ دس تومان کی چیز سو تومان میں فروخت کر دینا ایرانی تاجر کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔' [1]

(۱۵) ایرانیوں کی مہمان نوازی، اخلاق و عادات، طور طریقے اور ان میں غیر ملکیوں کے آداب و رسوم کے متعلق جاننے کی جستجو کے متعلق مصنف کا بیان، ان کے تجربات، مشاہدات اور احساسات کی غمازی کرتا ہے۔ بطور مثال ذیل کا اقتباس پیش خدمت ہے:

'غیر ملکیوں اور بے گانوں کا احترام ایرانیوں کے لئے دینی احکام کی طرح واجب ہے۔ سینما کے ٹکٹ کے لئے یا بس میں سوار ہونے کے لئے بے حد لمبی لائن لگی ہے۔ غیر ملکی شخص نظر آجائے تو فوراً اسے سب سے آگے جگہ دی جائے گی۔ ٹرین میں ایک نشست خالی ہے، ایک خارجی سب سے پیچھے کھڑا ہے سو ایرانیوں کو ہٹا کر اسے بلایا جائے گا کہ "آقا شما بفرمائید۔ شما مہمان ما ہستید"۔ یعنی آپ تشریف لائیے، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ گھروں میں غیر ملکی مہمان رکھنے کا بہت رواج ہے۔ آپ کو خاندان کا ایک فرد سمجھا جائے گا۔ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا جائے گا اور آپ کے رسم و رواج اور کلچر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے ہر فرد بے حد مشتاق نظر آئے گا۔' [2]

(۱۶) یہ کتاب جامع اور پُر از معلومات ہونے کے ساتھ قارئین کی دلچسپی اور دل بستگی کا سامان مہیا کرتی ہے۔

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳۶۱-۳۶۲

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳۶۹-۳۷۰

مصنف نے نہ صرف یہ کہ ایران کے متعلق مختلف موضوعات پر عمدہ اور بیش قیمت معلومات بہم پہنچائی ہیں بلکہ خشک موضوع کے بیان یا ذکر کے دوران فضا کو پُرکیف بنانے کے لئے دلچسپ واقعات، لطائف وکوائف وغیرہ کا بھی سہارا لیا ہے۔ بطور مثال ذیل میں چند دلچسپ واقعات پیش کیے جا رہے ہیں ۔

'ساسانیوں کے دَور حکومت میں ایرانی دربار کی اہمیت اور پابندی اور بھی زیادہ ہوگئی۔ اس زمانے میں بادشاہ لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے اور ارکانِ سلطنت تک ان کے نزدیک نہیں جا سکتے تھے۔ بادشاہ اور درباریوں کے درمیان ایک بڑا پردہ آویزاں کر دیا جاتا تھا جس سے بادشاہ تک کسی کی نگاہ نہیں پہونچ سکتی تھی۔ فقط عید نوروز (۱) اور جشن مہرگان (۲) کے مواقع پر دربار عام ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی نقیب اعلان کرتے رہتے تھے کہ بادشاہ کے حضور میں زبان ہلانا یا نظر اٹھانا معیوب ہے۔' ؎۱

شاہ آقا خان قاچار کی کنجوسی کا واقعہ عشرتؔ صاحب نے بڑے ہی دلچسپ اور لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے

'شاہ کی کنجوسی ضرب المثل تھی۔ آقا محمد خاں قاچار کا قتل ہی خسّت کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک خربوزہ دوپہر کے کھانے پر منگوایا تھا، نصف حصہ کھا کر بقیہ نصف رات کے کھانے کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ شب کو جب وہ ٹکڑا طلب کیا گیا، تو پتہ چلا کہ تین ملازموں نے آپس میں تقسیم کر کے کھا لیا ہے۔ شاہ کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے حکم دیا کہ دوسرے دن صبح ان تینوں کے سر اڑا دیئے جائیں۔ ملازموں نے اپنی جان بچانے کے لئے راتوں رات خود شاہ کا سر اڑا دیا۔' ؎۲

ایران کے خشک وتر میووں کی معلومات اور تربوز یا خربوزہ کا اصفہان یا خراسان سے آگرہ درآمد ہونے کے متعلق مصنف نے جو روایت بیان کی ہے وہ دلچسپ تو ضرور ہے لیکن حقیقت سے کتنی قریب ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ملاحظہ فرمائیں :

؎۱ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۴۲

؎۲ ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۳۰۸

حواشی: (۱) ایرانی کلنڈر کا پہلا دن یعنی ماہ فروردین کی پہلی تاریخ ہے۔ یہ ایران کا قومی دن ہے جس میں ایران کے ہر گھر میں جشن منایا جاتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کے آغاز پر مبارکباد دیتے ہیں۔

(۲) یہ جشن عید نوروز کے بعد سب سے بڑا جشن ہے۔ جو مہر ماہ کے مہینے کی ۱۶ ویں تاریخ سے ۲۱ ویں تاریخ تک منایا جاتا ہے۔ اس جشن کے آغاز کی روایت ہخامنشی دور سے ملتی ہے۔

'ایران میں خشک و تر میوے بہ کثرت ملتے ہیں۔ تربوز اور خربوزے بہت شیریں اور فراواں ہیں۔ اصفہانی تربوز اور خراسانی خربوزے دُور دُور تک مشہور ہیں۔ سترہویں صدی میں ہندوستان کے مغل حکمراں ان میووں کو آگرہ میں طلب کرتے تھے۔ ایک آدمی اپنے کندھوں پر لکڑی رکھ کر دونوں طرف ایک ایک ٹوکری لٹکا لیتا تھا اور ان ٹوکریوں میں ایک ایک تربوز یا طالبی (خربوزہ) رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی دن پیدل چلنے کے بعد یہ میوے آگرے پہونچ جاتے تھے۔ سخت خربوزوں اور تربوزوں کو زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے اور یہ موسم سرما تک محفوظ رہتے ہیں۔ ایرانی تربوز کی بیس سے زیادہ قسمیں موجود ہیں اور یہی حال انگور کا ہے، جو بے حد سستے ہیں اور بعض اوقات آٹھ دس آنے کیلو کے حساب سے دستیاب ہوتے ہیں'۔ [1]

(۱۷) اس کتاب میں جدید ایران کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ جدید ایران کے بارے میں لوگوں کی عام معلومات بہت ناقص ہیں ایسی کوئی کتاب اُردو زبان میں شائع نہیں ہوئی جس سے جدید ایران کا واضح تصور آنکھوں کے سامنے آجائے۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کا نقش اول ہے، جس میں ایران کی قدیم روایت کے ساتھ ساتھ جدید علم کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین مصنف کو ایک اہم جدید ایران شناس تصور کرتے ہیں۔ [2]

مصنف نے جدید ایران کا ماحول مغربی تہذیب کا اثر، آبادی، مختلف قبائل کی موجودگی، رہن سہن، کاروبار، اسٹور، دوکانیں، سودے بازی، بھیک بازی، تجارت، بازار، شہر، سڑکیں، سواری، گاؤں، رہائش گاہ، حمام خانے، قہوہ خانے، مے خانے، ہوٹل، لباس، کھان پان، خورد و نوش، میووں کی فراوانی، آداب و معاشرت، مہمان نوازی غرض یہ کہ تمام پہلوؤں کو بہت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی فصل 'ایران نَو' کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

'یورپ اور امریکہ سے آنے والے سیاحوں کے لئے جدید ایران کا ماحول بادی النظر میں بہت کچھ مختلف معلوم نہیں ہوتا، لیکن ایک ہندوستانی کو تھوڑی دیر کے لئے یہ دنیا یکسر نئی دکھائی دیتی ہے۔ مغربی تمدن کی چھاپ اگرچہ بہت گہری نہیں ہے، پھر بھی نووارد کو کچھ دیر تک یہ احساس ضرور رہتا ہے کہ یہ حافظؔ و خیامؔ کا وہ دیش نہیں ہے جس کی جھلک اس نے فارسی کلاسیکی ادب میں دیکھی ہے۔ مغربی لباس میں ملبوس عورتیں ایرانی سے

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۳۶۵-۳۶۶
[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۱

امریکی دکھائی دیتی ہیں۔ بلاؤز اور اسکرٹ اور کوٹ پتلون اور نکٹائی نے دیہاتوں میں بھی اپنا وقار قائم کرلیا ہے۔ گورے چٹے ایرانیوں کا حسن شروع سے ہی ضرب المثل رہا ہے۔ دستار و کلاہ اور بند و نقاب سے آزاد ہو کر اب اس کی شہرت اور بھی عالم تاب ہو رہی ہے۔ شیراز اور اصفہان میں کہیں کہیں قدیم مشرقی روایات بھی نظر آجاتی ہے۔ لیکن اس کے خیابانوں سے گزر کرتے وقت یہ سوچنا بھی بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے کہ ہم لوگ کسی مشرقی ملک کے دارالخلافہ میں ہیں۔' [1] *

اسی طرح موجودہ دور کے ایرانیوں کی شعر و ادب سے دلچسپی، شعری نشستوں کا اہتمام، پیروڈی کا رواج، ایرانیوں کا قابل رشک حافظہ، شخصی حکومت کے باوجود جمہوری تصورات کی موجودگی، ایرانی سماج میں 'طبقہ مالکین' تاجروں اور زمینداروں کی اہمیت، مذہبی عالموں اور ملاؤں کی قدر و منزلت، مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والوں کی آبادی کا تناسب، شیعی مذہب کی سرکاری سرپرستی اور مذہبی رواداری وغیرہ کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ جدید ایران میں مذہبی رواداری کے متعلق ذیل کا اقتباس دلچسپ اور مختلف مذاہب کے درمیان بین الاقوامی بھائی چارگی کو فروغ دینے والا ہے۔

'شیعی مذہب کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے لیکن دوسرے مذاہب کا احترام بھی ہمیشہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ زاہدان، تہران اور دوسرے شہروں میں ہندوستانی گرودواروں کے قیام کے لئے حکومت کی طرف سے پوری آزادی دی گئی ہے۔ زاہدان کا پرانا نام 'وزد آب' تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے زہد و عبادت اور گرودوارے کے قیام کے پیش نظر اب اس شہر کا نام زاہدان رکھ دیا گیا ہے **۔ تہران کے خیابان برق میں ایک خاصی تعداد سکھ تاجروں کی ہے۔ جنھوں نے ایران میں موجود ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک بہت عمدہ گرودوارہ قائم کیا ہے۔ یہاں امتیاز مذہب و ملت کے بغیر مسافروں کے قیام و طعام کا بھی بہت اچھا انتظام ہے۔ ہندوستانی زندگی کے روحانی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے ایسے معابد کا قیام بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔' [2]

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳۵۷-۳۵۸

* [انقلاب اسلامی کے بعد کا ایران اس سے بہت مختلف ہے۔] — (عباس)

** [اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب رضا شاہ پہلوی نے زاہدان کا سفر کیا تو سکھوں کا ایک دستہ اس کی پذیرائی کے لئے گیا۔ دستار بند لوگوں کو دیکھ کر اس نے کہا کہ 'ایں زاہداں ہستند' باید بجا را 'وزد آب' گفت۔ یہ زاہدان ہیں اس جگہ کو وزد آب نہیں کہنا چاہیے۔ اسی دن سے یہ شہر زاہدان کہلانے لگا۔] — (عباس)

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳۲۴-۳۲۵

فنون لطیفہ کے متعلق بھی مصنف نے بڑی دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مصوری، قالین بافی، قالیچہ بافی، موسیقی کاری، لوک گیت وغیرہ پر بھی بہت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اسی طرح زبان وادب کے عنوان سے ایران میں مقامی بولیوں پر جدید فارسی کی چھاپ، فارسی کو عربی اصطلاحات سے دور رکھنے کی ایرانیوں کی کوشش، عربی الفاظ کا اس کے قواعد کے خلاف استعمال، تلفظ میں تغیرات، خارجی الفاظ کا استعمال، پرانے الفاظ کا نیا استعمال، دستور زبان میں تبدیلیوں کو مثالوں کے ساتھ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایران کی ناول نگاری، افسانہ نگاری، علمی اور تحقیقی نگارشات، نشر واشاعت وغیرہ پر بھی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کے تعلق سے جدید فارسی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حفیظ بنارسی یوں رقم طراز ہیں

'جدید فارسی زبان اور شاعری کے متعلق بھی خاصی معلومات بہم پہونچائی گئی ہے اور جدید شاعری کے کچھ اچھے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ غرض کہ کتاب کو ہر حیثیت سے دلچسپ، مفید، مکمل اور جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔' [1]

جدید فارسی شاعری پر مصنف نے طویل گفتگو کی ہے۔ جدید ایرانی ادب پر مغرب کے اثرات، قوم پرستی اور وطن دوستی کے جذبات، روحانیت کے بجائے جسمانیت کے عنصر کا غلبہ، غزل میں مربوط خیالات کا اظہار، آزاد اور غیر معّریٰ شاعری کا چلن، زبان وبیان کی سلاست اور سادگی کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ جدید فارسی شعرا محمد تقی بہار، ابو لقاسم لاہوتی، ابوالقاسم عارف، پروین اعتصامی، نیما یوشیج، نادر نادر پور، فریدون تولّلی، محمد حسین شہریار، رہی معیری کے ادبی محاسن بہت اچھے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان شعرا کے فارسی کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے فارسی کلام کے انتخاب کے متعلق پروفیسر حفیظ بنارسی فرماتے ہیں کہ اشعار کا انتخاب مصنف کے پاکیزہ وبالیدہ مذاق شعری کا آئینہ دار ہے۔ [2]

(۱۹) یہ کتاب ہندوستان اور ایران کے باہمی روابط اور تعلقات کو استوار کرنے میں معاون ہے۔ موجودہ دور میں مغربی طاقتوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے ایشیا میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ سامراجوادیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور فوجی مداخلت نے ایشیائی ملکوں کے امن وامان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ مغربی طاقتوں نے یہاں اپنے فوجی بیڑے اور جدید فوجی ساز وسامان کے ساتھ فوجی اڈے بھی قائم کر رکھے ہیں۔ عراق کی فوجی طاقت اور اقتصادی حالت کو ان طاقتوں نے برباد کر دیا ہے۔ سوویت روس کے کئی حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد دنیا کا سیاسی توازن بگڑ گیا ہے۔ ان نامساعد حالات میں ہندوستان اور ایران کی اہمیت بڑھ گئی

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۰

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۲۰

ہے۔ یہ دو ممالک ایسے ہیں جو ان سامراجوادی طاقتوں کے خاص نشانے پر ہیں۔ اس صورت حال میں ہند و ایران کے باہمی روابط بہت اہم اور معنی خیز ہیں۔ قطع نظر اس کے ایک پڑوسی ملک ہونے کے ناطے بھی دونوں ملکوں میں مضبوط ربط اور دوستانہ تعلقات قائم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ حالاں کہ دونوں ملکوں کے روابط زمانہ قدیم سے خوشگوار رہے ہیں اور آج بھی ہیں مگر اس ربط ضبط اور میل جول کو اور وسعت دیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے دوسرے ضروری وسائل کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے قدیم و جدید تاریخی، ثقافتی اور ادبی رشتوں کی معلومات ہر خاص و عام تک پہنچائی جائے۔ اس سے دونوں ملکوں کے رشتے استوار ہونے کے ساتھ ساتھ آپسی بھائی چارگی اور میل ملاپ کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ اس سلسلے میں اختر اربنوی کا ذیل کا بیان بہت مناسب معلوم پڑتا ہے:

> 'ہند ایرانی ثقافتی تعلقات کا سلسلہ عہد قدیم سے مسلسل جاری ہے اس رشتے کو اچھی طرح جاننا اور اسے مضبوط تر کرنا چاہیے۔ آریہ ورت اور ایران میں قرب ہے۔ عہد اسلامی میں یہ تعلق اور استوار ہوا اور آج خواب گراں سے ہوتے ہوئے ایشیا کی نئی صبح میں ہند ایرانی روابط کو پائیدار بنانے کی کوشش لازمی ہے۔' [1]

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بھی زیر نظر کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> 'ایران ہندوستان کا پڑوسی ملک ہی نہیں، نسلی طور پر بھی ایک ہی ہے۔ لفظ ایران خود لفظ آریہ ہی سے مشتق ہے۔ آریوں کی شاخ اِدھر چلی آئی ایک اُدھر بس گئی، روابط برابر قائم رہے۔ سنسکرت اور اوستا کی زبانیں دیکھ لیجیے بیحد ملتی جلتی ہیں۔ پرانے دیوی، دیوتا، منتر اور اشلوک بھی بہت سے دونوں میں یکسانیت رکھتے ہیں۔ اس یکسانیت کی بنا پر ضروری ہے کہ ہم ایران کی تاریخ اور اس کے کلچر سے واقف رہیں اور پھر جب کہ فارسی زبان سلاطین دہلی اور عہد مغلیہ میں ہندوستان کی سرکاری زبان رہ چکی ہے۔ ایران سے متعدد ادیب و شاعر، دیگر علوم و فنون کے ماہر یہاں آکر اپنے کارنامے دکھا چکے ہیں اور یہاں کے کلچر اور ادب کو خصوصاً اردو ادب کو بہت کچھ متاثر کر چکے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے یہاں ایسی کتابیں تصنیف و تالیف ہوتی رہیں جن سے ہر دو ملکوں کے گذشتہ اور موجودہ مختلف قسم کے روابط کے متعلق معلومات بھی فراہم ہوتی رہیں اور ان میں استواری بھی پیدا ہوتی رہے۔' [2]

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۰

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۶-۱۷

(۲۰)　مصنف نے مختلف موضوعات سے متعلق قدیم و جدید اور مشرقی و مغربی ماخذ سے پورا استفادہ کیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے ماخذ کی فہرست میں فارسی کتب کی تعداد ۶۲ اور انگریزی کتب کی تعداد ۱۹ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ عشرتؔ صاحب نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید فارسی سے واقف تھے بلکہ فارسی زبان میں بڑی بے تکلفی اور روانی سے گفتگو بھی کرتے تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انھیں ویسی ہی دسترس حاصل تھی۔ چنانچہ ان صلاحیتوں کی بنا پر انھیں اپنے ماخذ کی تلاش کرنے اور ان سے پورا استفادہ کرنے کا بہترین موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ تصنیف اس موضوع پر لکھی گئی دیگر تصانیف سے کئی معاملے میں مختلف جہتوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ مختلف موضوعات پر قدیم و جدید اور مغربی و مشرقی کتابوں سے بیک وقت استفادہ کرنے کی وجہ سے زیر نظر کتاب نادر معلومات کا خزانہ بن گئی ہے۔ دلچسپ واقعات اور نئی نئی مفید معلومات، حلاوت اور تازگی کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر نذیر احمد نے اسے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے بہتر اور مفید تر بتایا ہے۔ [۱]

مصنف متعدد فارسی اور انگریزی کتابوں کے حوالوں سے ایران کے متعلق مختلف امور پر مروجہ غلط فہمیوں کی نشاندہی کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کتاب کے مواد کی فراہمی میں مصنف کی محنت اور کاوشوں کے متعلق پروفیسر حفیظؔ بنارسی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں

> 'مصنف کو اپنے اس گراں قدر کام کی انجام دہی میں جس قدر عرق ریزی اور جاں فشانی کرنی پڑی ہے اس کا اندازہ کچھ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف نے اس سلسلے میں فارسی اور انگریزی زبانوں میں دستیاب کم و بیش پانچ سو کتابوں کو کھنگالا ہے۔ ان سے استفادہ کیا ہے اور بہت سی مروجہ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔' [۲]

مصنف نے جن فارسی کتب سے استفادہ کیا ہے وہ ہندوستان میں دستیاب نہیں تھیں یہی وجہ ہے کہ زیر نظر کتاب کے فراہم کردہ معلومات زیادہ مثبت اور اہم ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر جوگندر سنگھ کا اعتراف ہدیۂ ناظرین ہے :

> 'جو منابع فارسی آپ نے استعمال کیے ہیں ہندوستان میں دستیاب ہی نہیں ہوتے۔ اس کتاب کا ہر ورق نئی معلومات کا حامل ہے۔' [۳]

(۲۱)　زیر نظر کتاب کا طرز تحریر سادہ، شستہ، شگفتہ اور دلکش ہے۔ اس کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ

---

[۱] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از: ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۲

[۲] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۹-۲۰

[۳] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۳

ہے کہ یہ عالمانہ ہونے کے ساتھ عام قاری کی دسترس اور فہم سے باہر نہیں ہے۔ اسلوب سادہ، سلیس، شستہ اور دلچسپ ہے۔ زبان عام بول چال کی استعمال کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب عالموں، دانشوروں، استادوں اور طالب علموں کے ساتھ ساتھ عام قاری کے لیے بھی نہایت دلچسپ اور کارآمد ہے۔

اس کتاب کے اسلوب نگارش کے بارے میں فراق گورکھپوری فرماتے ہیں :

> 'یہ کتاب نہایت شگفتہ اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہے اور ہمارے ملک کی بلند پایہ علمی تصنیفات میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔' [1]

اس کتاب کے طرز تحریر کے متعلق ماہنامہ رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ کے مدیر نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے

> 'اس جامع اور مفید کتاب کا طرز تحریر شستہ اور شگفتہ ہے۔' [2]

عام طور پر اردو والے ہندوستانی عناصر اور روایات سے ہٹ کر اپنی ادبی تشنگی کا سامان ایرانی خیابانوں میں تلاش کرتے ہیں۔ برعکس اس کے عشرتؔ صاحب ایران کے خیابانوں، حمام خانوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھ کر ایرانی پرواز نہیں کرتے۔ وہ ہندوستانی لغات اور روایات کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے عربی و فارسی کے دقیق اور مشکل الفاظ کے استعمال سے اجتناب کیا ہے۔

مصنف فارسی داں ہونے کے باوجود بھی اپنی فارسی دانی اور لیاقت کا نہ تو مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی تحریر میں فارسی کے نامانوس، ثقیل اور ناموزوں جملے یا فقرے استعمال کرتے ہیں۔ جہاں ان کا استعمال ناگریز تھا یا حسب موقع ضروری تھا وہاں انھوں نے فارسی جملے یا فقرے ضرور استعمال کیے ہیں لیکن ساتھ ہی اردو میں ان کا مطلب اس طرح واضح کردیا ہے کہ مفہوم کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے اور تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں :

> 'کیسی بھی بے تکلفی نہ ہو، آداب محفل کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ کسی کی طرف پشت کر کے بیٹھنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر بہ حالات مجبوری اس انداز سے بیٹھنا پڑے تو بیٹھنے والا ہزار دفعہ معذرت طلب کرتا ہے۔ دوسرے لوگ ایک خاص شاعرانہ انداز میں اس معذرت کا جواب دیتے ہیں. 'بہ فرمائید گل پشت و روی ندارد'۔ بیٹھے رہیے پھول پشت یا چہرہ نہیں رکھتا۔ کسی سے کوئی چیز وصول کر کے فوراً یہ جملہ کہا جاتا

---

[1] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، پہلا ایڈیشن (سرورق طلب)

[2] ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ، ص ۱۵

ہے: 'دست شما درد نکند'۔ یعنی آپ کا ہاتھ سلامت رہے۔ کسی چیز کی تعریف کیجئے مالک فوراً کہے گا:

'چشمہات قشنگ'۔ یعنی یہ چیز خوبصورت نہیں ، بلکہ آپ کا حسن نظر ہے، جو اسے خوبصورت بنا رہا ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست سے کسی دلچسپ محفل کا ذکر کر رہا ہے، پہلا جملہ یہی ہوگا: 'جای شما خالی، شب خیلی خوب گذشت'۔ یعنی رات لطف تو بہت رہا لیکن آپ کی کمی محسوس ہوتی رہی۔'[1]

زیر نظر کتاب کا اسلوب بیان بہت دلکش اور پر اثر ہے۔ خشک موضوع کو بھی مصنف نے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ زبان وبیان کی رعنائیاں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ حفیظ بنارسی کا ذیل کا بیان ان کے اسلوب نگارش پر گہری روشنی ڈالتا ہے۔

'میری نظر میں اس کتاب کی بڑی خوبی اس کا پُر کیف و دل پذیر انداز بیان ہے، ورنہ اکثر ایسی ضخیم کتابیں محض خشک واقعات کی کھتونی بن کر رہ جاتی ہیں اور ہمیں ان کے مطالعہ سے وہ کیفیت ومحویت نہیں حاصل ہوتی جس کی ایک اچھی اور عظیم کتاب سے توقع کی جاتی ہے۔'[2]

عشرت صاحب کہیں کہیں ہندی اور انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں لیکن یہ دال میں نمک کے برابر ہیں۔ موقع اور محل سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے گراں نہیں معلوم پڑتے۔ چند ہندی کے الفاظ یعنی 'سندر'، 'ودوان' وغیرہ اور انگریزی کے الفاظ 'کلاسیکل میوزک'، 'کنسرٹ'، 'ٹیپ ٹاپ'، 'ان نیچرل'، 'اسٹائل'، 'کاربن کاپی' وغیرہ بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

یہاں پر اس امر کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا کتاب کو حکومت اتر پردیش کی جانب سے 'اکبر الٰہ آبادی' انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ اگر چہ سرکاری یا غیر سرکاری انعام و اعزاز کسی مصنف یا تصنیف کو سند قبولیت نہیں بخشتے ہیں تاہم اس سے اس تصنیف کے وقیع، مفید اور کارآمد ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

اخیر میں ہم فراق گورکھپوری کے اس قول پر اپنی بات ختم کرتے ہیں 'زیر نظر کتاب 'ایران صدیوں کے آئینے میں' ان تمام ارباب ذوق کی علمی تشنگی بجھائے گی جو ایران کو صدیوں کی بدلتی ہوئی تاریخ کے آئینے میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ کہ یہ کتاب ہمارے ملک کی بلند پایہ علمی تصنیفات میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔

---

1. ایران صدیوں کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۱۹-۲۰
2. ایضاً

❁

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس
شعبہ اردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد

نصیرالدین ہاشمی کی تحقیقی خدمات

اردو میں تحقیق کی بسم اللہ دکنیات سے ہوئی۔ اردو کے تحقیقی سرمایے کا بڑا حصہ دکنی زبان اور شعر و ادب کی تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔ دکنی تحقیق اپنے نقطۂ آغاز پر متاعِ قلیل تھی لیکن آج وہ اردو کی ادبی تحقیق کی میراثِ جمیل بن چکی ہے جس کے عظیم اور قابلِ فخر ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ دکنی تحقیق کی نشوونما اور بالیدگی میں جن محققوں نے شب روز عرق فشانی، دماغ سوزی اور دیدہ ریزی سے کام کیا اُن میں مولوی نصیرالدین ہاشمی کا نام ایک امتیازی شان اور منفرد آب و تاب کا حامل ہے۔ قدیم دکنی شعرا ادیبوں اور دکنی شہ پاروں کی تلاش و بازیافت میں ہاشمی صاحب کی خدمات، ان کے تحقیقی اکتسابات اور قلمی ارتسامات لاثانی اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ اُن کا شمار دکنی تحقیق کے اولین اساس گزاروں اور معماروں میں ہوتا ہے۔ دکنی ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے خاکسار یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ ہاشمی صاحب دکنی تحقیق کے اکابر اربعہ میں سے ایک ہیں۔ دیگر تین اکابر ڈاکٹر زور، مولوی عبدالحق اور حکیم شمس اللہ قادری ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی کے تحقیقی کارناموں کے تفصیلی جائزے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ اس مقالے میں راقم الحروف نے دو زاویوں سے اُن کی تحقیقی خدمات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک تو یہ کہ دکنی شعرا ادیبوں کی تلاش و بازیافت کے سلسلے میں ان کی کاوشیں جو ان کی تحقیقی کتب و مقالات کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ دوسرے مخطوطات کی وہ فہرستیں جن کے ذریعہ انہوں نے دکنی کے قدیم ادب پاروں کے مخطوطات سے اردو دنیا کو متعارف کرایا ہے۔

پہلی شق کے تحت ہاشمی صاحب کی کچھ کتابوں اور تحقیقی مقالات کے مجموعوں کا ذکر کیا جائے گا جن میں اول 'دکن میں اردو' ہے جو مولوی نصیرالدین ہاشمی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ یہ ان کی پہلی مطبوعہ تصنیف ہے جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ یہ کتاب پاکستان سے بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ ہاشمی صاحب اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہے چنانچہ اس کا آخری ایڈیشن تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہاشمی صاحب نے بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی، مغل، آصفیہ اور مابعد دور کے شعرا اور نثر نگاروں کے حالات اور ان کے کلام کا

نمونہ پیش کیا ہے اور ان کے فن پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب مختلف جامعات کے نصابوں میں شامل ہے۔ یہ ایک تاریخ ساز کتاب ہے۔ اسے اردو کی پہلی علاقائی ادبی تاریخ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد علاقائی ادبی تواریخ کی روایت کا آغاز ہوا اور متعدد علاقائی ادبی تاریخیں لکھی گئیں جیسے 'پنجاب میں اردو، ریاست میسور میں اردو، سخنورانِ گجرات، بمبئی میں اردو، بنگال میں اردو (وفا راشدی)، بہار میں اردو (اختر اورینوی)، راجستھان میں اردو (غوث شریف عارف) وغیرہ۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی کثیر الجہت مصنف تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر خامہ طرازی کی لیکن ان کا اصل میدان دکنی اور دکنیات تھا۔ وہ دکنی کے عظیم محقق اور دکن کی تاریخ وتہذیب کے متبحر عالم تھے۔ دکنی ادب کی تحقیق کے ضمن میں انہوں نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ علاقائی ادبی تاریخ کے سلسلے میں ان کی دوسری تصنیف 'مدراس میں اردو' ہے جو ۱۹۳۸ء میں شایع ہوئی۔ اس کے مضامین ابتدا میں دکن میں اردو میں شامل تھے بعد میں ترمیم واضافوں کے ساتھ علاحدہ طور پر پیش نظر کتاب کی صورت میں شایع ہوئے۔ اس کتاب میں ہاشمی صاحب نے علاقہ ارکاٹ و مدراس کے شعرا و ادیبوں کے حالات درج کئے ہیں۔ دکنیات کے سلسلے میں ان کی ایک اہم کتاب 'مقالاتِ ہاشمی' ہے جو ۱۹۳۹ء میں لاہور (پاکستان) سے شایع ہوئی۔ یہ ہاشمی صاحب کے چوبیس تحقیقی مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان پر نظر ثانی کر کے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مشمولات میں 'خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری، بہمنی حکومت کا ایک دکھنی شاعر (۰۰، رف ۱۹۳۲ء) خاور نامہ دکھنی، سلطان علی عادل شاہ ثانی کا ہندوستانی کلیات، ولی کے پہلے دکن کی اردو شاعری، ولی کا غیر مطبوعہ کلام (یوروپ کے دواوین سے)، وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے، شعرائے اردو کا ایک نایاب تذکرہ (فتوت کا تذکرہ شعرائے اردو) اور تمنا کا تذکرہ شعرائے اردو' اہم ہیں۔ باقی بارہ مضامین تبصرے ہیں جو مختلف کتابوں پر کیے گئے ہیں لیکن یہ تبصرے بھی تحقیقی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ جن کتابوں پر یہ تبصرے لکھے گئے ہیں ان میں شعر الہند (مولانا عبد السلام خان)، انڈیا آفس کا کیٹلاگ (مرتبہ بلوم ہارٹ)، تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی)، مقدمہ سب رس (مولوی عبد الحق)، مغل اور اردو (نصیر حسین خیال)، جواہر سخن (محمد حسن چریا کوٹی)، کیمبرج کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست (پروفیسر براؤن) اور پیرس کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست (A- Cabation) شامل ہیں۔ عرضِ حال میں ہاشمی صاحب نے کتاب میں شامل تمام مضامین کی فہرست دی ہے اور ہر مضمون کے محاذی اُس رسالے کا نام اور مہینہ وسال درج کیا ہے جس میں وہ شایع ہوا تھا۔ ہر مضمون کے اختتام پر بھی اس کے ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں نصیر الدین ہاشمی کے مضامین کا ایک مجموعہ 'دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین' آزاد کتاب گھر دہلی سے شایع ہوا۔

دکنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین فی الجملہ تو مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ 'حرف آغاز' میں ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ مجموعے میں شامل کرنے سے قبل اُن پر نظر ثانی کر کے کئی اور اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے مضامین میں 'قدیم اردو یا دکنی ادب کے موضوع'، 'قدیم اردو (دکنی) میں سیرت النبی کا ذخیرہ'، 'قدیم اردو کے قصص انبیا'، 'قدیم اردو (دکنی) میں نیچرل شاعری'، 'سلطان علی عادل شاہ ثانی اور اس کی اردو شاعری'، 'سلطان عبداللہ قطب شاہی کی اردو شاعری'، 'اردو میں لیلیٰ مجنوں کی داستانیں'، 'محمد حنیفہ کے متعلق منظوم داستانیں'، 'اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کا دیوان' اور 'مثنوی گلشن شعرا' شامل ہیں۔ ہر مضمون کے اختتام پر ماخذی رسالے کا نام دیا گیا ہے لیکن بعض جگہ یہ حوالہ چھوٹ بھی گیا ہے۔ بعض جگہ رسالے کا نام تو ہے لیکن مہینہ وسال کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ 'حرف آغاز' میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں

'میرے مضامین میں عمق اور گہرائی نہیں ہوتی اور نہ رنگینی، لطافت، دلچسپی یا دلکشی تلاش کی جائے تو کامیابی ہوگی۔ میں سطحی طور پر اپنی تحقیق پیش کرنے کا عادی ہوں۔'

ظاہر ہے یہ محض مصنف کا انکسار ہے ورنہ ان کے مضامین میں تنقیدی بصیرت بھی ہے اور تحقیقی شعور بھی۔ پیش نظر مجموعے میں سلطان علی عادل شاہ ثانی اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری پر لکھے گئے مضامین اس کا اچھا نمونہ ہیں۔ ان کے ہاں لفاظی اور عبارت آرائی نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن تحقیقی تحریروں میں اس کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہوتی اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اپنی عبارت کی سادگی پر ہاشمی صاحب کو معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

دکنی ادب کی تحقیق اور تحسین کے سلسلے میں ہاشمی صاحب نے بیسیوں کارنامے سرانجام دیے۔ ان کی چند اہم دریافتیں یہ ہیں: انھوں نے اپنے مضمون 'بہمنی عہد کا ایک دکنی شاعر' کے ذریعہ جو رسالہ معارف اعظم گڑھ (اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں شائع ہوا، اردو کی اب تک کی پہلی معلوم مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کا تعارف کرایا۔ کتب خانہ سالار جنگ کی ایک قلمی بیاض سے نصرتی کا قطعۂ تاریخ وفات ڈھونڈھ نکالا اور اس کے سنہ وفات کا تعین کیا۔ اردو کی پہلی نثری داستان 'سب رس' کے سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ کا تعین کیا۔ برہانپور کے علاقے سے علی عادل شاہ شاہی کی کلیات دریافت کی اور اس پر تعارفی مضمون لکھا جو معارف (بابت ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا۔ رستمی کے خاور نامہ اور مقیمی کی مثنوی 'چندر بدن و مہیار' کے بارے میں پہلی مرتبہ نئی معلومات فراہم کیں۔ قصہ بہرام وگل اندام اور گلشنِ عشق کے بارے میں بھی تحقیقی مواد منظر عام پر لائے۔ کتاب نورس کے بارے میں سابقہ محققین کی اس غلط فہمی کو دور کیا کہ یہ علم موسیقی کی کتاب ہے۔ ہاشمی صاحب کی تحقیقی نگارشات نے متعدد دکنی شعرا و ادیبوں کو طاقِ نسیاں سے نکال کر انھیں علم وتحقیق کی روشنی میں ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ دکنی کا کوئی طالب علم یا محقق ہاشمی صاحب کی کتابوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس میدان میں قدم قدم پر ہاشمی صاحب کے نام اور کام سے واسطہ

پڑتا ہے۔

قدیم دکنی شاعروں اور ادیبوں کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں سے علمی دنیا کو روشناس کرانے کے ضمن میں نصیر الدین ہاشمی کی دو اور کتابیں 'سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری' (شایع شدہ ۱۹۳۳ء) اور 'دکنی ہندو اور اردو' (شایع شدہ ۱۹۵۶ء و ۱۹۸۴ء) بھی اہم ہیں لیکن بخوف طوالت انھیں یہاں موضوع گفتگو نہیں بنایا گیا ہے۔

اب میں مقالے کی دوسری شق کی طرف آتا ہوں جس کے تحت اردو مخطوطات کی فہرست سازی میں نصیر الدین ہاشمی کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔

دکنی ادب کی تلاش وتحقیق اور اس کے ادیبوں اور شہ پاروں کے بارے میں مواد کی جستجو وتفحص کے شعبے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کا اہم کارنامہ مختلف کتب خانوں میں مخزونہ قدیم ادب پاروں کی وضاحتی فہرستوں کی تیاری ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ہاشمی صاحب نے جتنے کتب خانوں کی وضاحتی فہرستیں مرتب کیں اتنی فہرستیں اردو کے کسی اور محقق نے مرتب نہیں کیں۔ اس سلسلے میں ان کا اولین کارنامہ 'یورپ میں دکنی مخطوطات' ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شایع ہوئی۔ 'دکن میں اردو' کی اشاعت پر سابق ریاست حیدرآباد نے ہاشمی صاحب کو از راہ قدردانی انعام دینا چاہا تو انھوں نے حکومت سے خواہش کی کہ انعام کے بجائے انھیں قدیم ادب پاروں کی تحقیق کے لیے یوروپ جانے کے لیے مالی اعانت منظور کی جائے۔ اس طرح ۱۹۲۸ء میں یورپ گئے اور ۱۳ مہینے وہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، فرانس اور اٹلی کے کتب خانوں میں محفوظ قدیم دکنی مخطوطات کا مطالعہ کیا اور ان کی وضاحتی فہرست 'یورپ میں دکنی مخطوطات' کے نام سے مرتب کی جس میں انھوں نے ۱۵۹ مخطوطات کا تعارف کرایا ہے اور پیش رو یوروپی مستشرقین مثلاً بلوم ہارٹ وغیرہ کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی نیز بعض نادر ونایاب مخطوطات کے بارے میں اردو میں پہلی مرتبہ تحقیقی معلومات فراہم کیں۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات میں دکنی کے جن قلمی نسخوں کی وضاحت کی گئی ہے انھیں ہاشمی صاحب نے مختلف عناوین کے تحت رکھا ہے جیسے قطب شاہی مخطوطات، عادل شاہی مخطوطات، دور مغلیہ کے مخطوطات، میسور کے مخطوطات، ارکاٹ کے مخطوطات اور دور آصفیہ کے مخطوطات۔ کتاب کے آخر میں متعدد ضمیمے بھی ملحق ہیں جن میں اس کتاب میں مذکور مخطوطات کے بارے میں مزید وضاحتیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً فہرست مخطوطات بلحاظ کتب خانہ، فہرست مصنفین دکنی، مخطوطات جن کے مصنفین نامعلوم ہیں۔ فہرست مخطوطات بلحاظ حروف تہجی وغیرہ۔ قدیم ادب کی تحقیق میں قدم قدم پر وضاحتی فہرستوں سے استفادے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ مختلف مستشرقین مثلاً اسٹیوارٹ، اشپرنگر، چارلس ریو (Charless Rieu)، بلوم ہارٹ اور براؤن وغیرہ نے یورپ کے کتب خانوں میں مخزونہ مخطوطات کے جو کیٹلاگ تیار کیے ہیں وہ عام محققین اور ریسرچ اسکالرس کی دسترس میں

نیں ہیں بلکہ یہ خود مخطوطات کی طرح نایاب ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال میں نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف، پ میں دکھنی مخطوطات، دکنی محققین کے لیے یورپ کے مختلف شہروں میں محفوظ دکنی مخطوطات کے جامِ جم کی حیثیت رکھتی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست بھی مرتب کی جو ۱۹۵۷ء میں شایع ہوئی۔ یہ کام انھوں نے دو سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اس فہرست کے مشمولات کو ہاشمی صاحب نے فنون میں تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں۔ ۱۔اسلامیات ۲۔مذاہب ۳۔فلسفہ ۴۔سائنس ۵۔کارآمد فنون ۶۔فنون لطیفہ ۷۔لسانیات ۸۔ادبیات ۹۔ تاریخ۔

ہر فن کے تحت کئی ضمنی فنون ہیں۔ مثلاً ادبیات کے فن کے تحت دواوین، مذہبی قصے، قصص انبیا، شہادت نامے، مناقب و فضائل اہلبیت، منظوم افسانے، نثری افسانے اور ڈرامہ کے زیرِ عنوان چھے ضمنی فنون ہیں۔ اس طرح کل ملا کر ۲۷ ضمنی فنون ہیں جن کے تحت نصیر الدین ہاشمی نے ۱۰۲۵ کتابوں کی تشریح اور وضاحت قلمبند کی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہاشمی صاحب نے ۱۳۴۲ مخطوطات کا تعارف کرایا ہے۔ پہلی جلد میں ۷ فنون کے تحت ۷۳۰ مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اور دوسری جلد میں ۸ فنون کے تحت ۶۱۲ مخطوطات کی وضاحت درج کی گئی ہے۔ ہاشمی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی ایماء پر ۱۹۵۰ء میں کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست کا کام شروع کیا لیکن مالیہ کی عدم فراہمی کے باعث اس کی اشاعت تعویق میں پڑی رہی۔ بالآخر ۱۹۶۱ء میں کتب خانہ خواتینِ دکن کے زیرِ اہتمام سرکاری تعاون سے اس کی اشاعت عمل میں آئی جبکہ اس دوران کتب خانہ سالار جنگ اور دیگر کتب خانوں کی وضاحتی فہرستیں جن پر ہاشمی صاحب نے بعد میں کام کیا تھا، چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔

نصیر الدین ہاشمی نے 'دفتر دیوانی و مال کے ہندوستانی مخطوطات' کے عنوان سے سنٹرل ریکارڈ آفس (اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد) میں محفوظ اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کی جو ۲۳ مخطوطات پر مشتمل تھی۔ یہ فہرست ۱۹۳۵ء میں رسالہ ہندوستانی (الہ آباد) میں شایع ہوئی۔ بعد میں انھوں نے اس فہرست میں مزید (۱۹) قلمی کتابوں کا اضافہ کر کے اسے 'سنٹرل ریکارڈ' آفس کی اردو قلمی کتابوں' کے عنوان سے رسالہ 'نوائے ادب' کی دو اشاعتوں (اپریل و جولائی ۱۹۵۶ء) میں شایع کیا۔ یہ فہرست 'کتاب نورس، کلیات شاہی، علی نامہ، ریاض العارفین، تحفۃ النصائح وغیرہ جیسی اہم دکنی تصانیف کے بشمول اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ۴۲ مخطوطات کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس دفتر میں سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلیات کا نادر و نایاب نسخہ موجود ہے جو ساری دنیا میں اس کلیات کا واحد مخطوطہ ہے۔ اسی طرح یہاں کتاب نورس کا جو مخطوطہ محفوظ ہے، عادل شاہی کتب خانے کا ہے جو عادل شاہی دور کے مشہور خطاط عبد اللطیف کا کتابت کردہ ہے۔ اس مخطوطے پر مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دستخط ہیں اور

شاہی مہر بھی۔ اس مخطوطے کا آغاز موسیقی کی دیوی سرسوتی کی تعریف سے ہوتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے حیدرآباد عجائب گھر (حیدرآباد میوزیم) میں محفوظ اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست بھی مرتب کی جس میں چودہ قلمی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہاشمی صاحب کی مرتبہ یہ فہرست 'حیدرآباد (دکن) کے عجائب خانہ کی اردو قلمی کتابیں' کے عنوان سے رسالہ نوائے ادب بمبئی بابت جنوری ۱۹۵۵ء، اپریل ۱۹۵۵ء اور جولائی ۱۹۵۵ء جملہ تین قسطوں میں شایع ہوئی۔ اس ادارے میں محفوظ قدیم اردو سے متعلق کتابوں میں 'جواہر اسرار اللہ' (شاہ علی محمد جیوگام دھنی)، نورس (ابراہیم عادل شاہ ثانی)، گلشن عشق (نصرتی) اور پنچھی باچھا (وجدی) شامل ہیں۔ ہاشمی صاحب نے اس فہرست میں دو ہندی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے ان میں ایک 'پورن سدپرت دکی کندہ' ہے جو مہابھارت کے دسویں حصے پر مشتمل ہے۔ 'پورن سدپرت پران' ہے۔ دونوں کا رسم خط اردو ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کو وضاحتی فہرستوں کی اہمیت و افادیت کا خوب اندازہ تھا۔ انھوں نے حیدرآباد کے متعدد کتب خانوں میں مخزونہ مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں تیار کیں اور ان مخطوطات سے دنیائے ادب و تحقیق کو متعارف کروایا۔ اس سلسلے میں جامعہ نظامیہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست بھی شامل ہے۔ حیدرآباد کی اس قدیم دینی درس گاہ کے کتب خانے میں عربی، فارسی اور اردو کی قلمی کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہے۔ ہاشمی صاحب نے ان میں سے اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست تیار کی جو رسالہ نوائے ادب بمبئی بابت جنوری اور اپریل ۱۹۵۵ء میں دو اقساط میں شایع ہوئی۔ اس میں ۱۳۵ مخطوطات کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان مخطوطات کو درج ذیل فنون میں تقسیم کیا گیا ہے:

(الف) **اسلامیات**:- ۱۔ علوم قرآن ۲۔ حدیث ۳۔ فقہ و عقائد، اصول فقہ وغیرہ ۴۔ ادعیہ ۵۔ مناظرہ و کلام ۶۔ تصوف

(ب) **ادبیات**:- ۱۔ دواوین کلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ ۲۔ منظوم داستانیں، مثنویاں ۳۔ شہادت نامے، مراثی

(ج) **تاریخ** :- ۱۔ سیرت النبیؐ ۲۔ تاریخ ۳۔ سوانح عمری و مناقب

(د) **لسانیات**:- ۱۔ لغت، عروض، بلاغت، صرف و نحو۔

ان میں دکنی سے متعلق مخطوطات یہ ہیں۔ رسالہ توحید (شہ میر)، پنچھی باچھا (وجدی کرنولی)، من لگن (قاضی محمود بحری)، ارشاد نامہ (میر ابو صالح سرمست)، رسالہ تصوف (شاہ محمد قادری نور دریا)، معرفت القلوب (برہان الدین جانم [؟])، ہشت مسائل (برہان الدین جانم [؟])، آزاد نامہ (شاہ معظم)، دیوان چندا (مہ لقابائی چندا)، لعل و گوہر (عارف الدین خان عاجز)، روضۃ الشہدا (ولی ویلوری)، اعجاز احمدی (نوازش علی خاں شیدا) اور

رازق باری (والہ موسوی)۔

نصیر الدین ہاشمی نے جامعہ نظامیہ کے کتب خانے میں محفوظ اردو شعرا کے قلمی دواوین کی ایک الگ وضاحتی فہرست بھی مرتب کی تھی جو ۲۹ شعرا کے دواوین کے قلمی نسخوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ہاشمی صاحب کی یہ فہرست 'جامعہ نظامیہ حیدر آباد کے اردو قلمی دواوین' کے عنوان سے پندرہ روزہ قومی زبان کراچی بابت جنوری ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے اردو مخطوطات کی فہرست بھی مرتب کی تھی جو 'پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطات' کے عنوان سے رسالہ قومی زبان کراچی بابت نومبر، دسمبر ۱۹۶۴ء میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ مصنف کے بقول پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو مخطوطات کا اندراج دو فہرستوں میں ہوا ہے۔ ایک سراج الدین آذر کی مرتبہ فہرست اور دوسرے محمود شیرانی کے کتب خانے کی فہرست۔ ذخیرہ شیرانی کی فہرست میں مطبوعہ اور قلمی دونوں کتابیں شامل ہیں لیکن یہ بلحاظ فن مرتب نہیں کی گئی ہے۔

ہاشمی صاحب نے اپنے قیام لاہور کے دوران مندرجہ بالا فہرستوں کو سامنے رکھ کر اردو مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی۔ اس فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں اردو مخطوطات کی تعداد کیا ہے اور ان کے نام اور بعض کے مصنف کون ہیں۔ یہ فہرست انھوں نے بلا کسی توضیح و تشریح کے مرتب کی ہے۔ ہاشمی صاحب کی یہ فہرست دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اردو مخطوطات کا احاطہ کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں عطیہ محمود شیرانی کے اردو مخطوطات شامل ہیں۔ حصہ اول میں ۹۳ اور حصہ دوم میں ۹۰، کل ۱۸۳ قلمی نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں دکنی کی یہ کتابیں شامل ہیں: دیوان ولیؔ، معراج نامہ بلاقیؔ، قصہ لعل و گوہر عاجزؔ، دیوان عاجزؔ، چندر بدن و مہیار (مقیمیؔ)، کرسی نامہ (حیاتؔ)، روضۃ الشہداء (ولیؔ ویلوری)، تنبیہہ النساء، پنچھی باچھا (وجدیؔ)، من لگن (بحریؔ)، معراج خوبی (خوبؔ محمد چشتی) اور قصہ تمیم وغیرہ۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اتنے کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرستیں دکن کے کسی محقق نے مرتب نہیں کیں۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی ہمارے ان بزرگ اور قابل احترام محققین میں سے تھے جنھوں نے دکنی زبان و ادب اور مشاہیر دکن کے کارناموں کی تحقیق اور نشر و اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے اس کام کو محض ایک ادبی سرگرمی نہیں سمجھا بلکہ ایک مقدس فریضے کی طرح پورے اخلاص و انہماک اور جستجو و لگن کے ساتھ انجام دیا۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر بیسیوں کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے، ان سب کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے۔ ہاشمی صاحب کی شخصیت اور کردار کا خاص وصف ان کی شرافت اور منکسر المزاجی ہے۔ وہ دکن کے عظیم محقق، صف اول کے ادیب اور اردو کے علمی و ادبی حلقوں کی ممتاز اور باوقار شخصیت تھے لیکن ان میں

خود پسندی، انانیت یا علمی غرور نام کو نہ تھا۔ پروفیسر گیان چند جین راوی ہیں کہ ایک مرتبہ ہاشمی صاحب نے کمال انکسار سے ان سے کہا 'میرا علم زیادہ نہیں اس لیے میری تحقیق میں غلطی رہ جاتی ہے' (گیان چند، ذکر وفکر، ص ۲۳۲)۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر ہاشمی صاحب کے ہاں کچھ پہلو کمزور ہوں تو اس میں حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ عین فطری امر ہے۔ یہ ان کی بڑائی ہے کہ دکنی ادب کے قافلہ سالار ہونے کے باوجود انھوں نے دراز نفسی نہیں دکھائی۔ کتب خانہ آصفیہ کی وضاحتی فہرست جلد دوم کے آغاز میں اپنے قلم کو خاکساری کے بام کمال تک پہنچاتے ہوئے لکھتے ہیں

'مجھے ادیب ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ نقاد، میں مورخ ہوں اور نہ محقق، البتہ
مجھے اپنی مادری زبان اردو سے محبت اور شفقت ہے اسی شغف کے تحت میں
گزشتہ چالیس سال سے اپنی استطاعت کے مطابق اردو کی خدمت کر رہا
ہوں ..... مجھے اپنی تہی مائیگی کا اعتراف ہے۔'

مجھے معلوم ہے اے ہاشمی کم مائیگی اپنی   مگر میں کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں اردو کی محبت میں

اس طرح کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرست کے آخر میں 'نقطۂ اختتام' کے عنوان سے لکھتے ہیں

'میں نے اپنی استطاعت کے مطابق جو معلومات حاصل ہوئے ان کو پیش
کردیا ہے اور مجھے اپنی علمی بے مائیگی کا اعتراف ہے۔'

انجم جہاں میں نام کی پروا نہیں مجھے   تا حد سعی کام کیے جا رہا ہوں میں

اردو زبان کی محبت میں سرشار رہنا اور اس کے فروغ وترقی اور بقا واستحکام کے لیے تا حد سعی کام کرنا یہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کی سیرت و کردار کے سب سے نمایاں اور تاب ناک پہلو ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کی نسل کے لیے ان کی شخصیت کا پیغام بھی یہی ہے کہ ہم اردو زبان سے محبت اور اس کے بے مسلسل محنت و جد، وجہد کریں تا کہ یہ زبان تعصب اور تنگ نظری کی مسموم ہواؤں میں بھی علم، تحقیق، اور تہذیب و شائستگی کی شمیم جاں فزا بن کر ملک وملت کی شیرازہ بندی کرتی رہے۔

Dr. Md Naseemuddin Farees
10-3-291/9/B
Vijaya Nagar Colony
HYDERABAD – 500 057 [A P]

❁

افتخار راغب

ڈاکٹر ظفر کمالی
زیڈ اے اسلامیہ کالج
سیوان۔ ۸۴۱۲۲۶

افتخار راغب- احوال و آثار و انتخاب کلام

افتخار راغب کا شجرۂ نسب اس طرح ہے

افتخار عالم ابن شیخ محمد ابراہیم ابن شیخ سلیم ابن شیخ محمد جھنکھن ابن شیخ نثار علی ابن شیخ مولا بخش۔ شیخ محمد جھنکھن کا آبائی پیشہ کاشت کاری تھا۔ ان کے چار بچے تھے (۱) شیخ ڈھونڈھا (یہ پہلوان اور اپنے علاقے میں مشہور تھے)، (۲) شیخ محمد سلیم، (۳) شیخ دباری اور (۴) شیخ علی حسین۔ ان چاروں بھائیوں میں محمد سلیم نہایت سادہ مزاج انسان تھے۔ یہ لمبے قد کے گورے چٹے خوبصورت شخص تھے۔ ان کے دل میں قربانی کا جذبہ بہت تھا۔ اپنوں اور بیگانوں میں سے کوئی ان سے جو چیز بھی طلب کرتا، یہ کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔ طبیعت میں نفاست بہت تھی۔ کپڑوں کی صفائی ستھرائی کا یہ عالم تھا کہ بستر مرگ پر بھی بغیر استری کا کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ یہ تجبت اور برما میں عطر فروشی کا کام کرتے تھے۔ ان کی شادی موضع صندلی نزد برولی ضلع سارن حال ضلع گوپال گنج میں شیخ رفاعت حسین کی صاحب زادی حبیب النساء سے ہوئی تھی۔ حبیب النساء کا انتقال ۱۹۷۴ء میں ہوا۔ محمد سلیم نے ۳ر جون ۱۹۹۷ء کو وفات پائی اور نرائن پور قبرستان میں مدفون ہوئے۔

شیخ محمد سلیم کو قدرت نے تین اولادوں سے نوازا۔ سب سے بڑی ایک لڑکی تھی جس کا بچپن میں ہی وصال ہوگیا۔ بقیہ دو لڑکے شیخ محمد صدیق اور شیخ محمد ابراہیم ہیں۔ شیخ محمد صدیق سرکاری مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم جنھوں نے اپنے والد کا مزاج پایا ہے، میٹرک کے بعد ہتھوا سے آئی-ٹی-آئی کا کورس کیا۔ پہلے یہ کھیتی کیا کرتے تھے۔ آئی-ٹی-آئی کے بعد ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب گیے اور وہاں ایک برس رہ کر واپس چلے آئے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ دوحہ قطر گیے اور بیس برس ملازمت کرنے کے بعد ۲۰۰۱ء میں مستقل طور پر گھر واپس آگیے اور کاشت کاری میں مشغول ہوگیے۔ ان کی شادی نوتن ہریا (گوپال گنج) میں انوری خاتون بنت شیخ عمر علی سے ہوئی۔ خوشدامن کا نام خاتون جنت ہے۔

شیخ محمد ابراہیم کو تین لڑکے ہیں: (۱) افتخار عالم (۲) اظہار عالم اور (۳) ذوالفقار ابراہیم۔ اظہار عالم نے جامعہ ہمدرد سے بی-فارم کیا، ابھی مستقل ملازمت نہیں ہوئی۔ ان کی شادی موضع رام پور بھینسی نزد شام پور

ساسا موئی میں امیر الحق کی دختر زرینہ خاتون سے ہوئی۔ ذوالفقار ابراہیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ڈپلوما ان میکینکل انجینئرنگ مکمل کرنے کے بعد جے پور رجنل انجینئرنگ کالج سے ڈگری (بی-ای) کررہے ہیں اور ابھی کنوارے ہیں۔

افتخار عالم تخلص راغب کی پیدائش ۳۱؍مارچ ۱۹۷۳ء میں بروز شنبہ نرائن پور میرگنج ضلع گوپال گنج (بہار) میں ہوئی۔ سرکاری تاریخ پیدائش ۲؍مئی ۱۹۷۵ء ہے جو درست نہیں۔ دوسرے بھائی کی پیدائش کے بعد افتخار کو ان کی نانیہال نوتن ہرنا بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کی بسم اللہ خوانی ایک درویش کے ذریعہ کرائی گئی جو اکثر نوتن ہرنا آیا کرتے تھے۔ ان کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔ افتخار کے نانا شیخ عمر علی عصری اور دینی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ مزاج دینی تھا۔ محلے کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ ان کی بہو اور بیٹی پڑوس کی بچیوں کو اپنے گھر میں پڑھایا کرتی تھی۔ ان کے لڑکے ضیاء الدین احمد شام کے وقت پڑوس کے لڑکوں کو بلا معاوضہ تعلیم دیتے۔ افتخار کی ابتدائی تعلیم اپنی چھوٹی خالی شہیدہ خاتون کے ذریعہ ہوئی۔ انھوں نے گھر پر اردو اور عربی پڑھائی پھر ان کا داخلہ نوتن کے سرکاری اسکول میں کرایا گیا۔ وہاں دو سال پڑھنے کے بعد اپنے گھر واپس آئے اور اسلامیہ اردو اکیڈمی میں دوسرے درجے میں داخل ہوئے۔ وہاں سے تیسرے درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں گھر سے قریب ہی مولوی اسمٰعیل میموریل اردو ہائی اسکول بنی گنج (سیوان) میں پانچویں جماعت میں داخلہ ہوا۔ یہ پرائیوٹ اسکول تھا۔ میٹرک کا فارم اُچکا گانو (گوپال گنج) سے بھرا گیا۔ ۱۹۸۹ء میں اول درجے میں کامیاب ہوئے۔ آئی-ایس-سی ۱۹۹۱ء میں کالج آف کامرس (پٹنہ) سے اول درجے میں پاس کیا۔ اسی کالج میں ابھی بی-ایس-سی تھرڈ پارٹ میں تھے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے انجینئرنگ کے مقابلے میں کامیاب ہوئے اور وہاں ۱۹۹۴ء میں داخلہ لیا۔ ۱۹۹۸ء میں سیول انجینئرنگ میں B Tech کیا۔ چھ مارچ ۱۹۹۹ء میں دوحہ قطر میں ملازمت اختیار کی اور ابھی وہیں قیام ہے۔ چونکہ افتخار کے والد ملازمت کے سلسلے میں مستقل باہر رہے لہٰذا افتخار کی والدہ نے ان کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لی جس کے وہ دل سے معترف ہیں۔

۱۷؍جولائی ۱۹۹۶ء میں افتخار کی شادی بر مد ابن تھاوے کے مصباح الدین احمد کی دختر قرۃ العین سے ہوئی۔ نکاح مولانا مظہر الحق ابن محمد رسول مدرس مدرسہ سراج العلوم سیوان نے پڑھایا جو اس وقت مذکورہ مدرسے کے مہتمم ہیں۔ دین مہر مبلغ پانچ ہزار ایک روپے سکۂ رائج الوقت مقرر ہوا۔ افتخار کے چار بچے ہیں: (۱) عادل افتخار (۲) شاغل افتخار (۳) مدیحہ کلثوم (۴) داصل افتخار۔ ازدواجی زندگی خوشگوار ہے۔ بیگم افتخار کی تعلیم تو گھریلو ہے، اس کے باوجود شوہر کے مزاج کے مطابق خود کو ہم آہنگ رکھتی ہیں۔

افتخار کا قد اوسط اور رنگ سانولا ہے۔ چہرے پر ہلکی داڑھی ہے۔ عام پوشاک پینٹ شرٹ ہے۔

کھانے پینے میں کوئی خاص پسند نہیں لیکن کھانا جو بھی ہو اس کا خوش ذائقہ ہونا ضروری ہے۔ نماز پڑھتے ہیں لیکن مکمل طور پر اس پر کاربند نہیں رہ پاتے۔ روزے پورے رکھتے ہیں۔ مزاج اسلامی ہے۔ قیامِ پٹنہ کے دوران میں اسٹوڈنٹ اسلامک آرگنائزیشن کے پروگراموں میں برابر شریک ہوتے رہے لیکن اس کے باضابطہ ممبر نہیں تھے۔ اسی آرگنائزیشن کے ہفتہ وار پروگرام کے تحت ابونصر فاروق صاحب قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے۔ افتخار ان کی شخصیت اور علم سے بہت متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر احمد عبدالحیٔ کی مسجد کے درسِ قرآن میں بھی وہ ذوق و شوق کے ساتھ شامل ہوتے۔ جب یہ جامعہ ملّیہ کے طالب علم تھے تو انھیں اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کی جانب سے اسکالرشپ بھی ملی تھی۔

افتخار راغب جب ہندوستان میں ہوں تو راقم الحروف سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ دوحہ قطر سے بھی گاہے بگاہے فون سے گفتگو ہو جاتی ہے۔ میں نے ہر ملاقات میں ان میں تہذیب و شائستگی کی وہ جھلک دیکھی جو عصرِ حاضر میں کمیاب ہے۔ ان کی گفتگو نپی تلی اور مہذبانہ ہوتی ہے۔ مزاج میں خاکساری ہے لہٰذا خاکسار طبیعت لوگوں کو پسند بھی کرتے ہیں۔ انانیت پسند حضرات سے چڑھتے اور جو لوگ اپنے منھ میاں مٹھو بنتے اور ہمیشہ اپنا ہی ذکرِ خیر کرتے رہتے ہیں، ان سے متنفر رہتے ہیں۔ وہ بذلہ سنج ہیں۔ بات میں بات پیدا کر کے دوستوں کو خوش رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ منظم زندگی بسر کرنے کی کوشش برابر کرتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کسی کام میں ضرورت سے زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کا یہ شعر ان کی طبیعت کا عکاس ہے ۔

تم بہت سوچنے کے عادی ہو
تم گنواتے رہو گے ہر موقع

اختلاف سے بچنے کی سعی کرتے رہنا ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں جب یہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے، اپنی ایک ہم جماعت سے انھیں معصومانہ عشق ہو گیا لیکن تین برس بعد اس لڑکی کی جب پڑھائی بند ہو گئی تو اس عشق نے بھی دم توڑ دیا۔ عشق کا پتہ اس لڑکی کو بھی تھا۔ اس کے مرکزِ توجہ بننے کی وجہ سے افتخار اپنی زندگی کی 'خرافات' سے محفوظ رہے۔ اس حادثے کو زمانہ بیتا لیکن اس وقت کی یاد آج بھی ان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔

افتخار کی دائیں آنکھ کمزور ہے۔ پٹنہ میں ڈاکٹر آر این پانڈے ماہرِ امراضِ چشم نے ۱۹۹۲-۱۹۹۳ء میں مشورہ دیا تھا کہ پڑھائی چھوڑ دیں ورنہ دوسری آنکھ کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر کی رائے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی تعلیم مکمل کی لیکن آنکھ کی کمزوری سے اردو کی ادبی کتابیں کم پڑھیں جس کی وجہ سے ان کی اردو کی بنیاد کمزور رہ گئی۔ لہٰذا ان کی تحریروں میں آج بھی کہیں کہیں املا کی غلطیاں راہ پا جاتی ہیں۔

ان کے گھر کا ماحول ادبی نہیں تھا لیکن افتخار کی طبیعت میں بچپن سے ہی ایک قسم کی موزونیت تھی۔ اردو کی درسی کتابوں میں جو نظمیں تھیں انھیں زبانی یاد کر کے گنگناتے رہتے تھے۔ شعر گوئی کی ابتدا ابائی اسکول کے زمانے میں ہی ہوگئی تھی۔ وہ رمضان کے ترانے لکھتے اور فلمی نغموں کی پیروڈیاں بھی۔ بقول خویش وہ شروع سے ہی انفرادیت پسند تھے۔ اسکول میں ڈرامے میں حصہ لیتے تھے۔ تربت کمشنری کے مقابلہ جاتی ڈرامے میں انھیں انعام سے نوازا گیا تھا۔ علم الحساب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ رسالوں میں دشوار سوالات ڈھونڈتے اور انھیں حل کرتے۔ پٹنہ جانے کے بعد ۱۹۹۰ء سے باضابطہ شاعری شروع کی۔ ابتدا میں وہ پٹنہ کے شاہ گنج محلہ میں رہتے تھے۔ قریب ہی کیفؔ عظیم آبادی کا قیام تھا۔ یہ ان کے پاس اصلاح کی غرض سے کچھ کلام لے کر گئے۔ کیفؔ نے حوصلہ افزائی تو ضرور کی لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے اصلاح سے معذرت کی اور اپنے استاد رمزؔ عظیم آبادی کے نام رقعہ لکھ دیا۔ رمزؔ صاحب نے انھیں اپنے حلقۂ شاگردی میں داخل کر لیا۔ انھوں نے کچھ غزلوں پر اصلاح کے ساتھ ساتھ شعری رموز و نکات سے بھی آشنا کیا۔ راغبؔ چونکہ سائنس کے طالب علم تھے اور انجینئرنگ میں داخلے کی تیاریوں میں مصروف تھے، اس لیے شاعری پر بھرپور توجہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب وہ مقابلے میں کامیاب ہو کر دہلی چلے گئے تو رمزؔ سے ان کا رابطہ باقی نہیں رہ سکا۔ انجینئرنگ کالج میں ان کے استاد ڈاکٹر آفاق احمد صدیقی ادبی ذوق رکھتے اور ایسے طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ راغبؔ نے انھیں بھی کچھ کلام دکھایا اور ان سے کچھ فنی نکات سیکھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ پڑھائی کی مدت میں پوری توجہ تعلیم پر ہونی چاہیے۔ شاعری کا ذوق باقی ضرور رہے لیکن شاعری تعلیمی سلسلہ مکمل ہونے کے بعد کی جائے۔

قطر جانے کے بعد روزگار کی تلاش کے ساتھ راغبؔ نے ادبی حلقوں سے روابط استوار کرنے کی کوشش کی۔ دربھنگہ (بہار) کے رہنے والے امجد علی سرورؔ سے جب ان کی شناسائی ہوئی تو انھوں نے قطر کے ادبی حلقوں سے ان کا تعارف کرایا اور پہلی بار 'بزمِ اردو' قطر کے سالانہ طرحی نعتیہ مشاعرے میں شریک ہوئے اور امجد علی سرورؔ سے ہی باضابطہ اصلاح لینا شروع کیا۔

۱۹۹۰ء میں سب سے پہلے روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ میں ان کی ایک مناجات چھپی جس کا مطلع تھا۔

ہو مشعلِ ہدایت قرآن زندگی بھر
قائم رہے خدایا ایمان زندگی بھر

جامعہ ملیہ کے رسالے 'تہذیب' میں بھی کچھ غزلیں شایع ہوئیں۔ ۲۰۰۴ء میں 'ادارۂ ادب اسلامی ہند' دہلی کے زیرِ اہتمام راغبؔ کا پہلا شعری مجموعہ 'لفظوں میں احساس' زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں ایک حمد، ایک نعت شریف اور ایک مناجات کے علاوہ چورانوے غزلیں تھیں۔ ابتدا میں

انتظار نعیم، اسلم کولسری اور امجد علی سرور نے افتخار کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اشعار کی مجموعی تعداد ۶۳۷ ہے۔ ۲۰۰۶ء میں آدم پبلشرز نئی دہلی کے زیرِ اہتمام اس کا ہندی ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ افتخار نے نظمیں بھی لکھی ہیں، حمد و نعت، قطعات اور دوہے بھی، لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے ہی شاعر ہیں۔

افتخار راغبؔ کی زندگی جن بنیادی قدروں سے وابستہ ہے اس کی جھلکیاں ان کے کلام میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ انتظار نعیم نے بجا طور پر انھیں پاکیزہ احساس کا شاعر کہا ہے۔ ہر انسان کے اندر نفسِ لوامہ کی صورت میں ایک شیطان چھپا ہوتا ہے۔ اگر اس سرکش پر قابو نہ پایا جائے تو انسان زندگی بھر ظلمت کی وادیوں میں بھٹکتا رہ جاتا ہے۔ حرص و ہوس، جور و جفا، ظلم و استحصال، جبر و استبداد، مکر و فریب اور جاہ طلبی وغیرہ وہ مختلف صورتیں ہیں جن کا بہروپ بھر کر وہ شیطان ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ افتخار سادہ دل ہوتے ہوئے بھی مکر و فریب کی چالبازیوں سے خوب آشنا ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعہ اس شیطانی جال کو توڑنے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بعض جگہوں پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کوئی جوگی دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ وہ جوگی جب بھی گیان دھیان سے اپنا سر اٹھا کر اس مایا نگری کی جانب دیکھتا ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

مٹی کے ہیں مٹی میں مل جائیں گے ۔۔۔۔ رہ جائے گا چاندی سونا، کچھ نا

جھوٹے کا انجام بُرا ہے سچ بولو ۔۔۔۔ سچائی کا سر اونچا ہے سچ بولو
دل میں ہر دم خوف ہے سچ کھل جانے کا ۔۔۔۔ یوں جینا بھی کیا جینا ہے سچ بولو
جیون کیا ہے تند ہی میں اک ریت کا گھر ۔۔۔۔ کتنے پل زندہ رہنا ہے سچ بولو
اللہ دیتا ہے عزت بھی ذلت بھی ۔۔۔۔ جھوٹی شان میں کیا رکھا ہے سچ بولو
پیرو پیمبر تک راغبؔ محدود نہیں ۔۔۔۔ سارا عالم بول رہا ہے سچ بولو

تقسیمِ عظیم کے بعد ہند و پاک کے جن شعرا کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا، ان کی شاعری میں ہجرت کا کرب خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ ہجرت خاک و خون کے دریا سے گزر کر ہوئی تھی اس لیے اس کرب و اضطراب کی کیفیت کچھ اور تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ بدلتے منظر نامے میں تلاشِ رزق کے لیے لوگ بڑی تعداد میں اپنے وطن سے دور سات سمندر پار جانے پر مجبور ہوئے۔ لمبے لمبے عرصے تک اپنے وطن، اپنی مٹی اور اپنے عزیزوں سے جدائی بھی کسی ہجرت سے کم نہیں لیکن تقسیم عظیم اور موجودہ ہجرت کا ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اس ہجرت کا غم اجتماعی تھا اور موجودہ ہجرت کا درد انفرادی ہے۔ جو ادیب و شعرا اس ہجرت کا کرب جھیل رہے ہیں ان کے کلام میں اس المیے کا اظہار بڑی شدت سے ہوا ہے۔ حال ہی میں اس المیے سے دوچار پاکستانی شاعر یعقوب تصور کا مجموعۂ کلام 'سیپیوں کی قید میں' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ نمونے کے طور پر ان کے یہ تین اشعار دیکھتے چلیں۔

مسافرت کی صعوبت میں عمر بیت گئی | بچی تو پانو سے کانٹے نکالتے گزری
خدایا دشت نوردی کا شوق کس کو ہے | مسافروں نے فقط آب و دانہ چاہا ہے
صبح کو چہرہ جلے، شام کو آنکھیں بھیگیں | عمر صحرا میں کٹے، شہر میں گھر رکھتا ہوں

افتخار راغبؔ نے بھی اس دربدری کا عذاب سہا ہے بلکہ سہہ رہے ہیں لہٰذا ان کے یہاں بھی یہ خیال مختلف شکلوں میں بیان ہوا ہے جس سے ان کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً

اک اک لمحہ گن کر کاٹ رہا ہوں | ہجرت کے دن یا پتھر کاٹ رہا ہوں
پردیسی ہوں دیکھ لے اے تیرہ شب | کتنی مصیبت دن بھر کاٹ رہا ہوں

اک بڑی جنگ لڑ رہا ہوں میں | ہنس کے تجھ سے بچھڑ رہا ہوں میں

گر یہ دھوکا نہیں ہے تو راغب ہے کیا | تیرے ہونٹوں پہ مسکان پردیس میں

بے وطن ہو تو پھر پڑے گا ہی | واسطہ روز، روزِ محشر سے

پردیسی کو چین کہاں حاصل راغبؔ | گھر جا کر آرام سے سونا، سیکھے نا

افتخار راغبؔ کے کلام میں اسلامی افکار ونظریات کی چھاپ گہری ہے۔ جذبۂ اصلاح پسندی کی وجہ سے یہاں مقصدیت کی لے ذرا اونچی ہوگئی ہے اور یہ چیز غزل کے مزاج کو زیادہ راس نہیں آتی۔ کوئی بھی خیال اگر شعری تجربہ نہیں بنے یا اس میں کمی رہ جائے تو اس سے فن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راغبؔ اگر حالیؔ کی قدیم و جدید دونوں دَور کی غزلوں کا مطالعہ کریں تو انھیں اس کا احساس ہوگا کہ دوسرے دَور میں اخلاقیات کی علم برداری کی وجہ سے غزل کی مجموعی فضا خاصی خشک، بے کیف اور بوجھل نظر آتی ہے جبکہ دَورِ اوّل کی غزلوں میں ایک خاص کیفیت اور جاذبیت ہے۔ راغبؔ کے یہاں حسن وعشق کے موضوعات بھی ہیں لیکن ان کے یہاں رنگینی کم بلکہ برائے نام ہے۔ روایت کی پگڈنڈیوں پر چلنا انھیں زیادہ عزیز ہے۔ چونکہ ان کا دل حقیقت شناس ہے اور اصلاحی ادب کی جانب ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ ہے، لہٰذا وہ انسانی قدروں کے محافظ کی حیثیت سے زیادہ سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنی بات اشارے کنایے میں کم کہتے ہیں۔ ان کے یہاں صراحت زیادہ اور ابہام کم ہے۔ معنی کی ابھری سطح کی وجہ سے تہداریت کا فقدان ہے۔

راغبؔ کے اشعار میں ان کے ذاتی مشاہدے کا رنگ ہر قدم پر جھلکتا ہے۔ ان کا سماجی احساس بھی بڑا

بالیدہ ہے اور جا بجا سیاست کی پرچھائیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انداز فکر مثبت ہے۔ ان کی رجائیت پسندی ہی ان سے یہ کہلواتی ہے کہ ۔

اس درجہ اجالوں سے ہے رغبت مجھے راغبؔ
ہوتا نہ میں انسان تو ہوتا کوئی سورج

چھوٹی بحر کی غزلوں میں راغبؔ کا فن زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ایسی غزلوں میں سادگی کے ساتھ حسن بھی ہے اور لہجے کی دلکشی بھی۔ ان اشعار میں ان کے جذبہ کا سوز سمویا ہوا لگتا ہے ۔

چہرے سے خوشی ٹپک رہی تھی ۔۔۔ ہم طرزِ جہاں سے ہٹ کے روئے

قصرِ دل ہو گیا کھنڈر راغبؔ ۔۔۔ اس نے بھی کیسی حکمرانی کی

بڑے ہی کام کی مٹی مرے وجود میں ہے ۔۔۔ سو مجھ پہ بھی تو کبھی چشمِ کوزہ گر ٹھہرے

کہاں ہے آج تمہارا وہ جامِ جم راغبؔ ۔۔۔ ہمارے پاس تو جامِ سفال اب بھی ہے

جیسے اشعار دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں لیکن ایسے اشعار کی تعداد نسبتاً کم ہے۔

افتخار راغبؔ باصلاحیت فن کار ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ صاحبِ دل ہیں اور دل بھی ایسا جو چوٹ کھایا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ذرا سی توجہ سے اپنے لہجے میں وہ فنی رچاؤ پیدا کر سکتے ہیں جو عام شعرا کے بس کی بات نہیں۔ انھیں اس کا ادراک ہے کہ لفظوں میں احساس پرونا آسان نہیں ہوتا۔ افتخار کی محنت، ہمت، دھن اور فن کے تئیں سنجیدگی و شیفتگی کو دیکھتے ہوئے مجھے پوری توقع ہے کہ فن کی راہوں میں وہ تھک کر بیٹھیں گے نہیں بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان کا فن بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ان کے نام کو اعتبار کی سند بخشنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔

انتخابِ کلامِ راغبؔ

جی چاہتا ہے جینا جذبات کے مطابق ۔۔۔ حالات کر رہے ہیں حالات کے مطابق
جس درجہ ہجر رُت میں آنکھیں برس رہی ہیں ۔۔۔ غزلیں بھی اُگ رہی ہیں برسات کے مطابق

تم بہت سوچنے کی عادی ہو ۔۔۔ تم گنواتے رہوگے ہر موقع

ہم ہی کیا کیا گمان کر بیٹھے
اس نے پوچھا تھا حال بس یونہی

یوں ہی یاد آگیا کوئی راغبؔ
اور آنکھیں گئیں برس یونہی

اک بڑی جنگ لڑ رہا ہوں میں
ہنس کے تجھ سے بچھڑ رہا ہوں میں

جیسے تو نے تو کچھ کہا ہی نہیں
سارے فتنوں کی جڑ رہا ہوں میں

کوئی چشمہ کبھی تو پھوٹے گا
اپنی ایڑی رگڑ رہا ہوں میں

بھیس میں خواہشوں کے بیٹھے ہیں
دل میں سکھ چین کے لٹیرے سو

حرفِ ایثار سے ہے واقف تو
دوست بنتے رہیں گے تیرے سو

اپنی آب و ہوا کی فکر کرو
ہم پرندوں کے ہیں بسیرے سو

لڑتے لڑتے غموں کے لشکر سے
سخت جاں ہو گیا ہوں اندر سے

ہجر کی سرد رت سے واقف تھے
ڈھک لیا دل کو غم کی چادر سے

بے وطن ہو تو پھر پڑے گا ہی
واسطہ روزِ روزِ محشر سے

چار سر پر سوار ہیں راغبؔ
اک بلا کیا ٹلی مرے سر سے!!

اچھے دنوں کی آس لگا کر میں نے خود کو روکا ہے
سپنوں کی دیوار اٹھا کر میں نے خود کو روکا ہے

فرقت کے موسم میں کیسے زندہ ہوں تم کیا جانو
کیسے اس دل کو بہلا کر میں نے خود کو روکا ہے

واپس جانے کے سب رستے میں نے خود مسدود کیے
کشتی اور پتوار جلا کر میں نے خود کو روکا ہے

دنیا میں ہم پیڑ لگانا بھول گئے
جنت کے باغات کی باتیں کرتے ہیں

فرقت کا اک بار مزہ چکھ لو گے تو
آ جائے گا پھوٹ کے رونا سمجھے نا

مٹی کے ہیں مٹی میں مل جائیں گے
رہ جائے گا چاندی سونا سمجھے نا

کوشش کر لو اتنا بھی آساں نہیں
لفظوں میں احساس پرونا سمجھے نا

پردیسی کو چین کہاں حاصل راغبؔ
گھر جا کر آرام سے سونا سمجھے نا

گردشِ ایام نے پندار کا چھوڑ کر اک اک غبارا رکھ دیا
بے کلی راغبؔ رہے گی عمر بھر دل میں اس نے وہ شرارا رکھ دیا

گاہے گاہے زندگی سے زندگی ملتی رہی رفتہ رفتہ کٹ گئی قسطوں میں ساری زندگی
موسمِ فرقت میں راغبؔ سب کو ہے حاصل یہی پیاس سے جھلسی ہوئی خوابوں میں الجھی زندگی

پھر خطا مجھ سے ہوئی پھر بھولنا چاہا تجھے پھر تری یادیں مجھے دینے سزائیں آ گئیں
خوف و دہشت ہے عیاں ان کے ہر اک انداز سے زد پہ کس شہباز کی سب فاختائیں آ گئیں
کون ہے جو چاہتا ہے مجھ کو راغبؔ اس قدر ہر بلا کو ٹالنے جس کی دعائیں آ گئیں

فون اور ای میل میں راغبؔ ہے وہ لذت کہاں لطف تھا جو دیکھنے میں نامہ بر کا راستہ

ابرِ غم چھٹ جائے اس کی آس کیا کرتا کوئی میرا دل ہی تھا بہت حساس کیا کرتا کوئی
تھا مرا صحرا نوردی میں یہی رختِ سفر میرے ہونٹوں سے چرا کر پیاس کیا کرتا کوئی
دوسروں کو دوش دینے سے کچھ حاصل نہیں میری قسمت ہی میں تھا بن باس کیا کرتا کوئی
تھی جہاں مفقود راغبؔ اصلی نقلی کی پرکھ رکھ کے اصلی گوہر و الماس کیا کرتا کوئی

کل تلک تھے کسی اٹھتے ہوئے دریا کی طرح آج ہیں پیاس سے جھلسے ہوئے صحرا کی طرح
وقت کی ریت پہ حالات کے طوفانوں میں زندگی خاک ہوئی نقشِ کفِ پا کی طرح

کشتیِ زیست ڈبونے کے لیے سربستہ جسم کے بحر میں سانسوں کا بھنور ہے کوئی

دل کو ڈھارس تو میں دیتا ہوں مگر لگتا ہے عمر بھر تجھ سے ملاقات نہیں ہو سکتی
کیا کہوں شعر میں تجھ پر کہ کسی صورت بھی چھوٹا منھ اور بڑی بات نہیں ہو سکتی
دن اگر آج منور ہے تری قسمت کا مت سمجھنا کہ یہ رات نہیں ہو سکتی

بے زبانی کا تقاضا ہے کہ ہم چپ ہی رہیں
اس کہانی کا تقاضا ہے کہ ہم چپ ہی رہیں

درد ایسا ہے کہ پتھر کا کلیجہ پھٹ جائے
سخت جانی کا تقاضا ہے کہ ہم چپ ہی رہیں

کس نے بخشے ہیں ان آنکھوں کو ابلتے آنسو
حق بیانی کا تقاضا ہے کہ ہم چپ ہی رہیں

ٹوٹ جائے نہ بھرم پیار کا اک اک راغبؔ
خوش گمانی کا تقاضا ہے کہ ہم چپ ہی رہیں

روٹھ جائے گی نظر آنکھوں سے
مت بہا خونِ جگر آنکھوں سے

ایک اندھے کی نصیحت راغبؔ
پیار کرنا ہے تو کر آنکھوں سے

گئے وہ دن کہ خلوص و وفا سے گھر گھر میں
بس اک چراغ سے جلتے تھے ہر کسی کے چراغ

ازل سے زیست پہ میری قضا کا پہرا ہے
میں وہ چراغ ہوں جس پر ہوا کا پہرا ہے

یہ حق سے خوب ہیں واقف مگر نہ مانیں گے
کہ ان کے ذہن پہ راغبؔ انا کا پہرا ہے

رہِ حیات میں مثلِ غبار میں ہی کیوں
بکھر رہا ہوں سرِ رہ گزار میں ہی کیوں

کہیں بھی ظلم کی تلوار جب برستی ہے
تڑپنے لگتا ہوں بے اختیار میں ہی کیوں

یہ پوچھتا ہے مری ذات میں چھپا شاعر
غمِ حیات کا آئینہ دار میں ہی کیوں

سناؤ کوئی کہانی اگر محبت کی
نہ ابتدا کی سناؤ نہ انتہا سے کہو

فریب و مکر کی شاید کہ گرد چھٹ جائے
کبھی حقیقتِ شہباز فاختہ سے کہو

جب آپ کو خدا پہ مکمل یقین ہے
حیرت زدہ ہوں آپ کے ذہنی تناؤ پر

میں ہر دم قید رہنا چاہتا تھا
تری زنجیر ہی اچھی نہیں تھی

میں خط لکھتا اسے تو کیسے لکھتا
مری تحریر ہی اچھی نہیں تھی

ہمارے خواب تو دلکش تھے راغبؔ
مگر تعبیر ہی اچھی نہیں تھی

انا کے ہات سے باہر تو نکلو
حصارِ ذات سے باہر تو نکلو

کسے کہتے ہیں صحرا جان لو گے
حسیں باغات سے باہر تو نکلو

سمجھ لو گے کہ دنیا کیا بلا ہے
کبھی دیہات سے باہر تو نکلو

سحر دے گی قبائے نور راغبؔ
شبِ ظلمات سے باہر تو نکلو

کناروں سے مسلسل لڑ رہا ہے
نہ جانے چاہتا ہے کیا سمندر

مرا ظاہر ہے اک سیراب صحرا
مرا باطن کوئی پیاسا سمندر

سمندر کی بجھی کب پیاس راغبؔ
ہزاروں پی گیا دریا سمندر

پرانے اکڑتے چلے جا رہے ہیں
نئے جڑ پکڑتے چلے جا رہے ہیں

مقدر سے لڑتے چلے آ رہے تھے
مقدر سے لڑتے چلے جا رہے ہیں

ہے پُرخار یہ راستہ راستی کا
مگر گرتے پڑتے چلے جا رہے ہیں

دکھا کر ہمارا ہی سایا ہمیں
ہماری نظر نے ڈرایا ہمیں

نہ آنکھوں میں اپنی بسایا ہمیں
نہ اشکوں کی صورت بہایا ہمیں

دھواں ہے نہ شعلہ نہ کوئی شرر
یہ کیسی اگن میں جلایا ہمیں

ہمیشہ غبارِ سفر کی طرح
جہاں چاہا اس نے اڑایا ہمیں

کفِ افسوس اب ملنے سے کچھ حاصل نہیں راغبؔ
کوئی دم سوچتے گھر چھوڑ کر جانے سے پہلے ہی

ماضی کے ورق پلٹ کے روئے
یادوں سے تری لپٹ کے روئے

روئے خوب ٹوٹ کر کبھی ہم
خود میں کبھی سمٹ کے روئے

چہرے سے خوشی ٹپک رہی تھی
ہم طرزِ جہاں سے ہٹ کے روئے

ہم تھکنے لگے تو راستے بھی
قدموں سے لپٹ لپٹ کے روئے

ان کے ساتھ آسماں بھی رویا
جو اپنی زمیں سے ہٹ کے روئے

وہ چہرہ تھا اک کتاب راغبؔ
جس کے ہر ورق کو رٹ کے روئے

اک امتحاں سے گزر رہا ہوں
فصیلِ جاں سے گزر رہا ہوں

زمیں پر اب قدم کہاں ہیں
میں آسماں سے گزر رہا ہوں

کبھی حدودِ یقیں سے آگے
کبھی گماں سے گزر رہا ہوں

میں فکر و فن کی اڑان بھر کر
کہاں کہاں سے گزر رہا ہوں

وہاں وہاں کوئی نقشِ پا ہے
جہاں جہاں سے گزر رہا ہوں

میں زندگی کر رہا ہوں راغبؔ
کہ داستاں سے گزر رہا ہوں

مری گردن سے جب تیغِ ستم ایجاد ملتی ہے
زمانے بھر سے میرے حوصلے کی داد ملتی ہے

نہیں محتاج شعر و شاعری تعلیم کی لیکن
لہک اٹھتے ہیں وہ پودے جنھیں کچھ کھاد ملتی ہے

امیرِ شہر کی چشمِ کرم کو کون دکھلائے
کسے لوٹا حوادث نے کسے امداد ملتی ہے

محبت چاہتی ہے دیکھنا نمناک آنکھوں سے
کہانی میں کہاں تک ہجر کی روداد ملتی ہے

جہاں بھی دیکھتا ہوں کھود کر دل کی زمیں راغبؔ
کہیں آہیں نکلتی ہیں کہیں فریاد ملتی ہے

امید مت لگائیں تدبیر سے زیادہ
ملتا نہیں کسی کو تقدیر سے زیادہ

تقدیر سے زیادہ تدبیر آزمائیں
تقدیر پر یقیں ہو تدبیر سے زیادہ

گجرات سے زیادہ زخمی کیا گیا ہوں
ہے درد میرے دل میں کشمیر سے زیادہ

گرچہ میں قصرِ فن کی کمزور سی کڑی ہوں
لیکن ہے بوجھ مجھ پر شہتیر سے زیادہ

چاہت کی ڈور ہے یہ دو دل بندھے ہوئے ہیں
مضبوط ہے یہ دھاگا زنجیر سے زیادہ

فرصت کہاں کسی کو اس دورِ تیز رو میں
تلخیص کار گر ہے تفسیر سے زیادہ

ہوا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں
رہا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں

سرِ صحرا برسنا چاہتا ہوں
گھٹا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں

کہیں تو روشنی ہو جائے مجھ سے
دیا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں

میں کوئی قرض ہوں خود پر ہی راغبؔ
ادا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں

ظلمت کے غضب سے نہیں ڈرتا سورج ۔۔۔ تاریکی بڑھی حد سے کہ ابھرا سورج
کیا بھول گئے سارے اماوس کے پرستار ۔۔۔ کرتا ہے ہر اک رات کا پیچھا سورج
اس درجہ اجالوں سے ہے رغبت مجھے راغبؔ ۔۔۔ ہوتا نہ میں انسان تو ہوتا کوئی سورج

زلزلے کی زد میں آ کر یوں لگا راغبؔ ہمیں ۔۔۔ ذکر سنتے آئے تھے جس کا وہ محشر آ گیا

تیرے دل کو بھی میرے جی کو بھی ۔۔۔ چین اک پل نہیں کسی کو بھی
مصلحت میں شمار کرتے ہیں ۔۔۔ لوگ اب اپنی بزدلی کو بھی

کہاں خود میں سمٹ کر رہ گیا ہوں ۔۔۔ کئی حصوں میں بٹ کر رہ گیا ہوں
مقدر میں تھا تنہائی کا صحرا ۔۔۔ غبارِ غم میں اٹ کر رہ گیا ہوں
پلٹ کر آپ کو آنا تھا جس سے ۔۔۔ اسی رہ سے لپٹ کر رہ گیا ہوں
میں سب کو کاٹتا رہتا تھا راغبؔ ۔۔۔ زمانے بھر سے کٹ کر رہ گیا ہوں

کس قدر سنسان ہو کر رہ گئے ۔۔۔ ہجر میں ویران ہو کر رہ گئے
جب سے خیمہ زن ہوئے پردیس میں ۔۔۔ گھر پہ بھی مہمان ہو کر رہ گئے
مل گیا ایماں وراثت میں ہمیں ۔۔۔ صاحبِ ایمان ہو کر رہ گئے
آپ نے جب سے نگاہیں پھیر لیں ۔۔۔ بے سر و سامان ہو کر رہ گئے
حد سے جب راغبؔ بڑھی پیچیدگی ۔۔۔ ہم بڑے آسان ہو کر رہ گئے

بڑی مشکل ہوا کے سامنے ہے ۔۔۔ چراغِ دل ہوا کے سامنے ہے
جہاں چاہے وہاں بے خوف جائے ۔۔۔ ہر اک منزل ہوا کے سامنے ہے
ہوا ہو کر رہے گا جسم راغبؔ ۔۔۔ یہ مشتِ گِل ہوا کے سامنے ہے

دشتِ فرقت میں زندگانی کی ۔۔۔ حد نہیں میری بے مکانی کی
آج وہ چھاؤں کو ترستا ہے ۔۔۔ عمر بھر جس نے باغبانی کی

بے گھری سے اسے ڈراتے ہو
جس نے فٹ پاتھ پر جوانی کی

کچھ تو بولے کوئی کہ دنیا نے
جیتے جی کس کی قدر دانی کی

قصرِ دل ہو گیا کھنڈر راغبؔ
اس نے بھی کیسی حکمرانی کی

دل سے جب آن نکل جائے گی
جاں بھی ہمراہ نکل جائے گی

فن اگر لائقِ تحسین ہوا
خود بخود واہ نکل جائے گی

پھر سبھی جوڑ کے سر بیٹھے ہیں
پھر کوئی راہ نکل جائے گی

آدمی ہوں بہک بھی سکتا ہوں
مت سمجھ لینا دیوتا مجھ کو

جن کو بھرنے تھے کان بھرتے رہے
ہم وفا کی اڑان بھرتے رہے

بھرنے والے تو آندھیوں میں بھی
اپنی اپنی اڑان بھرتے رہے

وہ بھی خالی گئے جو دولت سے
زندگی بھر مکان بھرتے رہے

خونِ دل صرف کرکے ہم راغبؔ
اپنے شعروں میں جان بھرتے رہے

جب بھی وہ بام مجھ کو یاد آیا
کچھ ادھر کام مجھ کو یاد آیا

بچ کے رہتا تھا وحشتِ دل سے
ہو کے بدنام مجھ کو یاد آیا

پھر دھڑکنے لگا ہے دل راغبؔ
پھر وہ بے نام مجھ کو یاد آیا

فرقت کے زخم دل پر اس سے کہیں سوا ہیں
ہم ساتھ جتنے ڈالر دینار لے کے آئے

راغبؔ تمام خبریں ہوں گی اسی طرح کی
چھپر بنا کے دل کو اخبار لے کے آئے

بڑے ہی کام کی مٹی مرے وجود میں ہے
سو مجھ پہ بھی تو کبھی چشمِ کوزہ گر ٹھہرے

قدم قدم پہ بچھا ہے عدو کا دامِ فریب
کرو تلاش تو بچنے کی صورتیں بھی ہیں

وہ ہم سے ملتے ہیں راغبؔ بڑے خلوص کے ساتھ
یہ اور بات کہ دل میں کدورتیں بھی ہیں

میرے حالات کا اندازہ لگائے کوئی　　جسم کو ایک حوالات سمجھتا ہوں میں

سارے اشعار کس کے اچھے ہیں　　سارے قطرے گہر نہیں ہوتے
آپ کا ساتھ مل گیا ہوتا !!　　اس طرح در بدر نہیں ہوتے

کہاں ہے آج تمہارا وہ جامِ جم راغبؔ　　ہمارے پاس تو جامِ سفال اب بھی ہے

بالیقیں حاسدوں کے سینوں میں　　دل نہیں ہے کباب سا کچھ ہے
زندگی ہی بدل گئی راغبؔ　　عشق بھی انقلاب سا کچھ ہے

دیکھ لینے دو ہمیں خواب میں گھر کی صورت　　زندگی ہم نے گزاری ہے سفر کی صورت

[افتخار راغب کے حالاتِ زندگی ۱۰ر جنوری ۲۰۰۵ء کو راقم الحروف نے ان سے ذاتی ملاقات میں حاصل کیے۔ کلام کا انتخاب ان کے مجموعے 'لفظوں میں احساس' اور بعد کی غیر مطبوعہ غزلوں سے کیا گیا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام، افتخار راغب سے ہی حاصل ہوا۔ (ط۔ک)]

❁

کتبات

حسین آباد چہلا کے کتبے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یا عبادی الذین اسرفو علی انفسہم لاتقنطو من رحمة اللّٰہ/ ان
اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعا انه ھو الغفور الرحیم / صاحب این مزار رضیہ/ بنت غلام حسین
بن ہدایت علی خاں مرحوم شب پنجشنبہ ہشتم ذی قعدہ در سنہ یکہزار و دو صد و دو ہجری بجوار رحمت و غفران الٰہی در سن
بست و دو سال و سہ ماہ انتقال نمود و داغ جگر سوز بر دلہا گذاشت۔ اخلاق حمیدہ و صفات/ پسندیدہ داشت۔
حالت انتقال نیز غرابتی دارد بنابرین می نگارد۔ از مُردن بسیاری ترسید درین مرض پنج شش روز قبل از/ رحلت
ہنگامی کہ او را تپ عارض بود لمحہ چند چشمش غنود۔ امیر المومنین علی علیہ السلام را دید مابین شمال و مغرب قریب/ از
آرامگاہ او بر اسپ سوار ایستادہ اند و او نیز متصل برکاب استادہ و مقابل حضرت ناکسی چند بہ مجادلہ گفت و گوی
نمایند و تاب این/ جسارت نیاوردہ آنہا را وعید و تہدید می نماید و حضرت دلدہی او نمودہ می فرمایند کہ با جنگ من
باتوام او/ دلیر گشتہ عتاب و خطاب بیش از بیش می کند چون آنہا مغلوب و خاموش شدہ اند عرض احوال جو باآنجناب
/ کردہ میگوید کہ من از مرگ بسی می ترسم۔ حضرت فرمودہ اند مترس۔ موت چیز خوبست۔ ہیچ خوف و خطر ندارد و
راحت ہائے/ بسیار در ضمنش مندرج۔ او عرض نمودہ کہ چہ کنم کہ این ترس از من دور نمی شود۔ حضرت می فرمایند کہ
تو خود اکنون/ نمی میری۔ چرا می ترسی۔ وقتی کہ زمان مُردن تو خواہد بود من ترا بنوعی خواہم برد کہ ہرگز معلوم نخواہد
شد و بعد از/ موت در آن عالم لذتہا و راحتہاست کہ بیان نمی تواند شد۔ او عرض نمود کہ امیدوارم از آن عالم خبری
را بینم/ فرمودند کہ قبل از موت ادراک آن نمی تواند شد۔ او الحاح نمودہ عرض کرد کہ اندکی ازان بنظر من در آمد
فرمودند/ چہ مضایقہ۔ ہمراہ من شو۔ باز فرمودند کہ زیارت مالکۂ خود حضرت فاطمہ زہرا (صلوٰت اللہ علیہا) نمودہ
ہمراہ من بیا و بآستانہ کہ شش سال قبل از ارتحال زیارت حضرت مقدسہ خاتون جنت در آن مکان نمودہ بود و در
آنجا آستانہ بنا شدہ/ ہمراہ حضرت بزیارت آمدہ پس در رکاب حضرت روان شدہ۔ بعد طی اندک مسافت آثار
عمارات عالیہ/ و باغہای جنت مثال تو عیکہ از بیرون عمارات نمایان می شود بنظر در آمد و در بیرون آنجا جاہائے/
دید در کمال نضارت و صفا و والدۂ او ساکن در آنجا می خواہد کہ اندرون آنجاہا در آید حضرت می فرمایند کہ/ قبل از
وقت نمی تواند شد بعد ازین بیدار شدہ فقیر را طلبید و آنچہ دیدہ بود بیان نمود بندہ و جمیع سامعان را/ شفای او متیقن

شد چون شام شب موعود در رسید اندک بخاری کمتر از روز پیشین محسوس گشت۔ خور را از اطراف وا/ جواب درست پوشید و او را بطور معہود خواب غفلت روی داد و ہمان قسم خوابیدہ بہ ثلث شب بی آنکہ ہیچ شدت/ و اضطرابی کہ مشعر برفتن او باشد از ین جہان ناپایدار بدار القرار رحلت نمود و صدق مقال سید اوصیا علی/ مرتضی ظاہر شد خیر اللہ تعالی مع سید الانبیاء و المرسلین محمد و امیر المومنین علی عترتہما المعصومین و صلوات اللہ علیہم اجمعین/ **برحمتك يا ارحم الرّاحمين**۔ [1]

○

الحی القیوم لواہب القدیر ہو المتعال

۱۲۰۷

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

نوجوان سید محسن گل باغ اخلاق

رفت مانند صبا جانب گلزار بہشت

تا بماند بجہان نقش ز رحلت تاریخ

کلک تقدیر بفردوس خرامید نوشت

۱۲۰۷ھ/ (۱۷۹۲ء)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

علوی ہمت بلند فطرت ضمیر روشن امیر حاتم

میر سادت غریب پرور صاحب ایمان شریف کونین

قدم بدار الجنان نہادہ ز دل چو سال وفات جستم

ندای غیبی بداد ہاتف گرفت رہ حق حبیب حسنین

بہ تصنیف تاریخ منشی سری ناراین نایب خان مرحوم ۱۱۱۳ ہجری

---

[1] خط کشیدہ آخری جملہ زمین میں دب گیا ہے۔ (عباس)

هوالله الباقی

واصلهٔ بارگه ایزدی کرد سفر جانب دار السّلام
خامهٔ تقدیر رقم کرد سال سیدهٔ یافت جنت مقام

بتاریخ نهم ماه ربیع الآخر روز دوشنبه سنه یکهزار و دو صد و نه هجری قدسی / واصله بیگم زوجهٔ غلام حسین خان ازین دار ناپایدار بجوار رحمت / پروردگار رحلت نمود و داغ فراق بر دل احباب گذاشت اللّٰهم اغفر / لها و ارحمها انك انت العفو الغفور ۔ حضرت واهب العطایا یا اجر / نیکوکاریهای او اضعف مضاعف عطا نموده در جوار عفو و رحمت خود جای دهد انه جواد کریم۔

قطعۂ تاریخ وفات سید حیات حسین وفاؔ طباطبائی حسین آبادی

از: غضنفر نواب دانش عظیم آبادی

خبر ملی ہے وفاؔ جب سے تیرے مرنے کی
خدا گواہ کہ دانشؔ کی روح ہے بے چین
جو فکر کی ہے تاریخ یہ سنی آواز
عجب ہے آج دلوں پر غم حیات حسین
۱۹۷۳ء

بقیہ ص 200 پر

ناوک حمزہ پوری

قطعات تاریخ وفات پروفیسر نادم بلخی

[اردو کے مایہ ناز شاعر و ادیب پروفیسر نادم بلخی نے ۱۸ دسمبر ۲۰۰۶ء کو انتقال کیا۔ ان کے انتقال سے اردو کا جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اس کا احساس ان تمام حضرات کو ہوگا جو موصوف کی شخصیت اور کارناموں سے آگاہی رکھتے ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ان کے درجات میں اضافہ فرمائے۔ آمین]

حضرت نادم چون از دنیا برفت   سینۂ ما از غم ہجرش بسفت
ناوک محزون بگوید سال فوت   یک ہزار و چار صد و بیست و ہفت

حضرت نادم نے لی راہ جناں   ایک عالم ہو گیا ماتم کناں
پوچھتے ہیں لوگ سال فوت اگر   دو ہزار و شش کہو ناوک میاں

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

حسن عباس آگاہم نمودہ   کہ حضرت نادم شیریں بیان مرد
ادیب نکتہ دان و نکتہ سنجی   چراغ بزمہای شاعران مرد
یکی از جملۂ تاریخ دانان   انیس و ہمدم فرزانگان مرد
پرسیدم ز ہاتف سال فوتش   چو نادم بلخی ما ناگہان مرد

ندا آمد بگو "قد" در کشیدہ
۱۰۴

ادیب و شاعر و تاریخ دان مرد

۲۱۱۰
(-)۱۰۴
۲۰۰۶ء

دکتر رئیس نعمانی

قطعۂ تاریخ بنیان گذاری دانشگاہ محمد علی جوہر

(در شہر رام پور)

چو خواندم این خبر در روز نامہ	کہ از توفیق و تائیداتِ داور
بہ شہر رام پور، اُستانِ یوپی	بنا گردید دانشگاہِ جوہر
زبانِ شوقِ من برخواند، در دَم	بحمد اللہ و پس اللہ اکبر
نوشتم ارتجالاً بیت عالی	کہ دارد معنی بسیار در بر
ز چندین سال، ساعی بود، اعظم[1]	کنون گردید سعی او ثمر ور
نہادش سنگِ بنیادش ملائم[2]	بہ روز ہجدہ از ماہ سپتامبر[3]
بہ یمن پای مولانای رابع[4]	جبیں خاکش شدہ مانندۂ زر
در انجا کسبِ دانشہا نمایند	بہ تنہائی نہ فرزندانِ کشور
امیدم ہست، از گلہای دانش	کند این باغ، دنیا را معطر
دعا گویم کہ این بنیانِ زیبا	نبیند تا قیامت روزِ اَبتر
نگہدارد ز دستِ بد نہادان	بہ فضل و رحمتِ خود ربِّ اکبر
چو کردم جستجوی سالِ تاسیس	برای این بنای طرفہ منظر

رئیس از گوشہ ہای خاطرِ من

ندا آمد : ہوار و سہ، مکرر

۲ × ۱۰۰۳ = ۲۰۰۶ میلادی

P.O Box No. 114
ALIGARH- 202 002

---

1. محمد اعظم خان
2. ملائم سنگھ یادو
3. سپتامبر
4. مولانا محمد رابع حسنی ندوی

ڈاکٹر سید حسن عباس

طنزیاتِ عبید زاکانی

نظام الدین عبید اللہ معروف بہ عبید زاکانی فارسی کا ایک معروف و مشہور طنز و مزاح نگار، شاعر و نثر نگار گزرا ہے۔ وہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کا شاعر تھا۔ وہ بڑا صاحب فضل و کمال تھا۔ مگر وہی 'قدر نا شناسی' سے رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ اس کے ہم عصر شعرا میں حافظ شیرازی اور سلمان ساوجی کے نام اہم ہیں۔ عبید کا دیوان غزلیات، قصائد، قطعات، ترکیب و ترجیع بند وغیرہ پر مشتمل ہے اور کئی بار ایران و ہند میں شائع ہو چکا ہے۔ فارسی نثر میں کئی رسالے ہیں جن میں اس نے شیخ سعدی کی پیروی کی ہے اور بڑی بے باکی اور جرأت مندی سے معاشرے کی اصلاح کے لئے اپنی نثر و شاعری کا استعمال کیا ہے۔ اس کی فحش گوئی نے اسے بڑا نقصان پہنچایا اور اس کے دیگر آثار کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ وہ لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھا اس کے لطائف رسالہ دلگشا میں ملتے ہیں۔ قارئین ادراک کے لئے زاکانی کے کچھ لطائف کے ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ ایسے اور لطائف بھی آئندہ پیش کئے جاتے رہیں گے۔

ایک شخص کو جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، معتصم کے سامنے پیش کیا گیا۔
معتصم نے کہا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ایک احمق پیغمبر ہے۔
اس نے کہا۔ جی ہاں! اس لیے کہ تمہاری جیسی قوم پر مبعوث کیا گیا ہوں

ایک شخص نے مولانا عضد الدین (ایجی، صاحب کتاب مواقف) سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ خلفا کے زمانے میں لوگوں نے خدائی اور نبوت کا بہت دعویٰ کیا اور اب نہیں کرتے۔
مولانا نے کہا کہ لوگ اس زمانے میں اس قدر ظلم اور غربت و افلاس کا شکار ہیں کہ انھیں نہ تو خدا یاد آتا ہے اور نہ ہی نبی۔

مسعود رمّال نے راستے میں مجد الدین ہمایوں شاہ سے پوچھا کیا بو رہے ہو؟
اس نے کہا: ایسی کوئی چیز نہیں جو کام آوے۔
شاہ نے کہا: تیرا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے بھی کوئی ایسی چیز نہیں بوئی جو کام آئے۔

مازندران میں 'علا' نامی ایک نہایت ظالم حکمراں تھا۔ خشک سالی ہوئی تو لوگ نماز استسقا پڑھنے کے لیے نکلے۔ جب نماز سے فراغت ہوئی تو امام نے منبر پر ہاتھ اُٹھا کر دعا کی — اللّٰھمّ ادفع عنّا البلاء۔

و الوباء و العلاء۔

اتابک سلغر شاہ جب بھی کوئی مصحف اپنے ہاتھ سے لکھ کر تیار کرتا تو کچھ تحفے کے ساتھ اسے خانہ کعبہ کے لیے بھیج دیا کرتا اور باقی سال شراب نوشی میں مشغول رہتا۔ چند سال ایسا ہی کیا۔ ایک سال مجد الدین بھی موجود تھے۔ اس نے کہا: نیکی کرتے ہو اور جب نہیں پڑھتے تو اپنے خدا کے گھر کو بھیج دیتے ہو۔

ایک کسان اصفہان میں بہاء الدین صاحب دیوان کے دروازے پر گیا۔ خواجہ سرا سے کہا کہ جاؤ اور خواجہ سے کہو کہ خدا باہر بیٹھا ہے، تجھ سے کام ہے۔ اس نے خواجہ سے کہہ دیا۔ خواجہ نے اُسے اندر بلانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اندر آگیا تو پوچھا: تو خدا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔

خواجہ نے پوچھا: کیسے؟ اُس نے کہا: میں 'دہخدا' 'باغ خدا' اور خانہ خدا کے سامنے تھا۔ تمہارے کارندوں نے 'دِہ'، 'باغ' اور 'خانہ' پر قبضہ کر لیا اب صرف 'خدا' رہ گیا۔

ایک چور ایک رات ایک فقیر کے گھر میں گھس کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ درویش نیند سے جاگا تو کہا، اے شخص! تو جو کچھ اندھیرے میں ڈھونڈ رہا ہے، میں دن کی روشنی میں تلاش کرتا ہوں اور نہیں ملتا۔

شیطان سے پوچھا گیا کہ تو کس قبیلے کو دوست رکھتا ہے؟ اس نے کہا: دلالوں کو۔ اس لیے کہ میں ان کی جھوٹی باتوں ہی سے خوش تھا۔ انھوں نے تو اس میں جھوٹی قسم کا بھی اضافہ کر دیا۔

راستے سے ایک جنازہ گزر رہا تھا۔ ایک درویش اپنے لڑکے کے ساتھ راستے میں کھڑا تھا۔ لڑکے نے باپ سے پوچھا، بابا یہ کیا ہے؟ کہا، آدمی۔ پوچھا اسے کہاں لے جا رہے ہیں؟ کہا وہاں جہاں نہ تو کھانے کی چیز ہے نہ پینے کی۔ نہ روٹی ہے نہ ایندھن، نہ آگ، نہ سیم وزر، نہ بوریا نہ کمبل۔

لڑکے نے کہا بابا کیا اسے ہمارے گھر لے جا رہے ہیں

ایک اعرابی کو خلیفہ کے سامنے لایا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ تخت پر بیٹھا ہے اور دوسرے اس تخت کے نیچے کھڑے ہیں۔ اس نے کہا: السلام علیک یا اللہ۔

خلیفہ نے کہا میں اللہ نہیں ہوں۔ اس نے کہا: یا جبرئیل۔ خلیفہ نے کہا، میں جبرئیل بھی نہیں ہوں۔

اعرابی نے کہا تو اللہ نہیں ہے، جبرئیل بھی نہیں ہے۔ پھر تنہا اوپر کیوں بیٹھا ہے۔ تو بھی نیچے آ اور سب کے درمیان بیٹھ۔

(تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

نقدِ عمر (مجموعۂ مقالات)

مصنف : ڈاکٹر عارف نوشاہی سنہ اشاعت : اپریل ۲۰۰۵ء
صفحات : ۳۶۵

ڈاکٹر سید عارف نوشاہی کا شمار برصغیر کے اُن علمائے ادب میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں کے سبب اپنا مقام بنایا ہے۔ انھیں فارسی زبان و ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ اسی دلچسپی کے سبب انھوں نے دانشگاہ تہران سے فارسی میں ایم۔اے اور ڈی۔لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آج کل وہ گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں صدر شعبۂ فارسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ فنا فی العلم ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ برصغیر کے تمام بزرگانِ علم و ادب سے ان کے ذاتی روابط ہیں۔ وہ پچاس سے زاید کتابوں اور رسالوں کے مصنف و مولف ہیں۔ 'نقدِ عمر' کے آخر میں ایسی چالیس کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے جو کتابی صورت میں شایع ہوئے ہیں۔ مجموعوں اور رسالوں میں شایع ہونے والے متون ان کے علاوہ ہیں۔ اسی طرح ان کے فارسی اور اردو میں لکھے مضامین کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ان کی مضمون نویسی کا آغاز روزنامہ جنگ راولپنڈی کی ۱۳ر نومبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شامل ان کے مضمون 'فضائلِ صوم' سے ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'اپنے پہلے مضمون 'فضائلِ صوم (اشاعت روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۱۳ر نومبر ۱۹۷۱ء) سے لے کر اب تک لکھے جانے والے تمام مضامین اور تحریروں کو اگر کسی مکمل فہرست کی شکل میں پیش کرنا چاہوں تو شاید اتنے ہی صفحات پر محیط ہو جتنے سالوں سے یہ سفر جاری ہے۔' (نقدِ عمر۔ حکایتِ نے، ص ۷)

ابتدائی دَور کے مقالات کی ایک نامکمل فہرست انھوں نے شریف التواریخ ۳ر حصہ ۱۱ (مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۴ء) میں درج کی ہے۔

ڈاکٹر نوشاہی نے متون کی تصحیح و تدوین کے ساتھ فارسی سے اردو اور اردو سے فارسی کتابوں/رسالوں کے ترجمے بھی کیے ہیں لیکن ان کی دلچسپی کا میدان مخطوطات ہیں۔ مخطوطہ شناس کی حیثیت سے ہندوستان، پاکستان اور ایران و افغانستان اور ترکی میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ انھوں نے اس میدان میں اتنی ترقی کی ہے کہ اس

عہد کے سب سے بڑے مخطوطہ شناس اور فہرست ساز آقای احمد منزوی نے انھیں اپنا شاگرد قرار دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر نوشاہی نے اپنی محنت، لگن اور وسیع مطالعے کی سبب سے یہ مقام حاصل کیا ہے جس میں اساتذۂ کرام کی راہنمائی اور دستگیری بھی شامل رہی ہے۔ اساتذہ کرام نے ان کی محنت اور لگن نیز مطالعے پر اعتماد بھی کیا اور ڈاکٹر نوشاہی ان حضرات کے اعتماد پر نہ صرف کھرے اُترے بلکہ اس سے بڑھ کر انھوں نے کام کیے۔ ۱۹۷۷ء میں مرکز تحقیقات فارسی اسلام آباد سے وابستہ ہوئے تو وہاں ممتاز ماہر کتابیات و مخطوطات استاد احمد منزوی کی راست نگرانی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مرکز کی کتابوں پر مقدمے لکھ کر انھوں نے اپنی محققانہ کاوشوں کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۷۵ء بھگوان داس ہندی مصنف 'سفینۂ ہندی' کے گم شدہ تذکرے 'حدیقۂ ہندی' کے مخطوطے کا انکشاف کیا اور مجلّہ دانش اسلام آباد میں اس پر ایک مفصل مضمون قلمبند کیا۔ بعد میں انھوں نے عزیز دوست جلال حسین (مرحوم) کو حدیقۂ ہندی کی تصحیح کا موضوع دے کر دانشگاہ تہران سے ڈاکٹریٹ کروایا۔ جب ڈاکٹر نوشاہی مجلّہ دانش اسلام آباد کے مدیر منتخب ہوئے تو ان کے علم اور مطالعے کو ایک اور وسیع میدان ملا۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'دانش کے قارئین کا حلقہ تبریز سے راجشاہی تک پھیلا ہوا تھا اور وہ فارسی زبان و ادب اور تہذیب کے حامل ممالک افغانستان، ایران، بنگلا دیش، پاکستان، ہندوستان کے اعلیٰ پایہ کے دانشوروں کو بھیجا جاتا تھا۔ دانش کی اشاعت میرے لیے اس وسیع خطے کے نام ور محققین سے رابطے کا ایک موقع پیدا ہوا۔ ان سے خط و کتابت کر کے اور ان سے مقالات حاصل کر کے بہت کچھ سیکھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ)، ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ)، ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی (دہلی)، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم (احمد آباد)، نجیب مایل ہروی (مشہد) سے تعلق اور کسب فیض اسی زمانے سے یادگار ہے۔' (نقد عمر۔ ص ۹)

دانشگاہ تہران میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ انھوں نے وہاں کے علمی و تحقیقی مراکز میں کام کر کے اور مختلف دائرۃ المعارف کے لیے مضامین لکھ کر اپنے ذہن کو جلا بخشی اور علمی و تحقیقی کاموں کی انجام دہی کے ہنر سیکھے۔ انھوں نے ایران، ترکی اور امریکہ و یورپ سے شایع ہونے والے انسائیکلو پیڈیاؤں کے لیے مقالات لکھے جو سب کے سب ان کی محققانہ حیثیت کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔ ۱۹۸۹ء سے اب تک زیادہ تر وہ فارسی میں ہی مضامین لکھتے رہے ہیں لیکن کبھی کبھی خاص کر جب موضوع برصغیر کا ہو تو پھر وہ اردو میں لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ فارسی مقالات کا ایک مجموعہ ۲۰۰۳ء میں موقوفاتِ ڈاکٹر محمود افشار تہران سے 'مقالاتِ عارف' کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ اردو مقالات کا یہ مجموعہ نقد عمر اورینٹل پبلی کیشنز لاہور سے اپریل ۲۰۰۵ء میں شایع ہوا ہے۔

'نقد عمر' دراصل فارسی ادب اور برصغیر و ایران کی مشترک ثقافت و تاریخ پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔

جس میں ۲۱ مضامین شامل ہیں۔ تین موضوعات 'مصنفین و شعرا' کے ذیل میں سات، 'تاریخی، تہذیبی، تنقیدی، ادبی مباحث' کے تحت چھے اور 'آثار و کتب' کے عنوان سے آٹھ مضامین شامل مجموعہ ہیں۔ ضمیمہ میں نوشاہی صاحب کی تصانیف، تالیفات، مرتبات اور تراجم کی فہرست ہے اور جن مخطوطات پر مباحث شامل مجموعہ ہیں ان کے چند اوراق کے عکس 'عکسیات' کے تحت دیے گیے ہیں۔ ذیل میں مقالات کی فہرست درج کی جارہی ہے۔

مصنفین و شعرا

۱۔ بدرالدین بدر کشمیری: حالات اور تصانیف، ۲) سید محمد بن جلال شاہی رضوی: چند فارسی تصانیف کا تعارف، ۳) محمد ہاشم کشمی کے بعض فارسی رسایل کی بازیافت، ۴) نصر اللہ بن عبد السلام بھیری اٹکی: بارہویں صدی میں پنجاب کے ایک مصنف اور کاتب، ۵) میر امین الدین خاں ہروی تتوی کی علمی خدمات، ۶) محمد ہاشم ایمن آبادی اور ان کی تصانیف، ۷) بابا محمد عثمان کشمیری: شاہ ولی اللہ دہلوی کے ایک شاگرد کے حالات و تصنیفات۔

تاریخی، تہذیبی، تنقیدی، ادبی مباحث

۸۔ برصغیر میں عوارف المعارف کی مقبولیت پر چند شواہد (آٹھویں صدی ہجری تک) ۹۔ خواجہ احرار کے حالات اور افکار پر چند بنیادی مآخذ، ۱۰۔ خواجہ باقی باللہ سے منسوب ایک رسالے کی اصلیت، ۱۱۔ صوفیاے بیجاپور کے دو اہم فارسی تذکرے، ۱۲۔ بلگرام کے ایک علمی خانوادے کی سندھ میں وقایع نگاری (کلہوڑا عہد میں)۔ ۱۳۔ بارہویں صدی ہجری میں لاہور کے چند علما۔

آثار و کتب

۱۴۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا ایک نایاب مجموعۂ تحریرات فتوحات المکیہ والفیوضات المدنیہ، ۱۵۔ کلیات وزیر / وزیری. گیارہویں صدی ہجری کے ایک تاتاری نژاد چینی فارسی گو کی شاعری، ۱۶۔ منتخب التواریخ مولفہ محمد یوسف اٹکی (تاریخ سندھ سے متعلق چند حوالے)، ۱۷۔ صداقت کنجاہی کی مثنوی 'خط بغداد'، ۱۸۔ والہ داغستانی کے دیوان کا ایک معاصر مخطوطہ اور اس کا اردو کلام، ۱۹۔ تذکرۂ حدیقۂ ہندی: برصغیر میں فارسی کے رواج و رونق کے بارے میں ایک اہم ماخذ، ۲۰۔ جام جہاں نما دربار لکھنو سے وابستہ ایرانی مصنف کی تاریخی و تہذیبی اہمیت کی تصنیف، ۲۱۔ شاہ غلام علی دہلوی مجددی کے ملفوظات: ایک نو دریافت مجموعہ۔

سارے مقالات تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی کے اس مجموعۂ مقالات کی علمی حلقے میں یقیناً پذیرائی ہوگی۔

سید حسن عباس

میر و مصحفی (مجموعۂ مضامین)

مصنف : پروفیسر حنیف نقوی   طباعت : بھارت آفسیٹ، گلی قاسم جان۔ دہلی ۶

سنہ اشاعت : ۲۰۰۳ء   صفحات : ۱۵۶   قیمت : دوسو روپے

پروفیسر حنیف نقوی صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) ہمارے ان اساتذہ میں ہیں جنھوں نے تحقیق کو سربلند و سرخ رو کرنے میں ایک عمر صرف کی ہے۔ یہ کتاب عصر حاضر کے انہی معروف محقق پروفیسر حنیف نقوی کے چھ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن کے بارے میں خود مصنف کا خیال یہ ہے کہ 'مصنف نے ان دونوں اساتذۂ سخن (میر و مصحفی) کی تصانیف اور شخصیات کے بعض پہلوؤں کے متعلق اپنے مشاہدات کو منضبط صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے'۔ یہ مضامین ۱۹۷۸ء سے مئی ۲۰۰۲ء کے دوران ہند و پاک کے مختلف ادبی رسایل و جراید میں شایع ہو کر اہل علم سے داد تحقیق وصول کر چکے ہیں اور مصنف نے ایک مجموعے میں انھیں شایع کر کے ہمارے لیے ان سے استفادے کی راہ آسان کر دی ہے۔ اس مجموعے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ میر کے دیوان سوم کا ایک نادر قلمی نسخہ ۲۔ نکات الشعرا کے چند خطی نسخے ۳۔ میر اور انعام اللہ خاں یقین ۴۔ مصحفی کا سال ولادت ۵۔ مصحفی سے منسوب دو تذکرے اور ۶۔ مصحفی کے ایک عزیز اور شاگرد، شیخ علی بخش بیمار۔

پہلے مضمون میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے ذخیرۂ مخطوطات لالہ سری رام میں موجود میر کے دیوان سوم کے ایک نادر قلمی نسخے کو پورے سیاق و سباق اور جزئیات کے ساتھ اہل علم سے متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے۔ نقوی صاحب نے بہت دقت اور باریک بینی سے اس کا جائزہ لیا ہے اور اس کے مطالب سے بڑی مفید بحث کی ہے اور اس کے اختصاصات و امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔

دوسرے مضمون میں میر کے معروف تذکرے 'نکات الشعرا' کے چند خطی نسخوں کا تعارف اور ان کے امتیازات سے بحث کی گئی ہے۔ جن نسخوں کو مورد بحث قرار دیا گیا ہے ان میں نسخۂ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نسخۂ انجمن ترقی اردو (ہند)، نسخۂ پیرس قومی عجائب گھر، نسخۂ رضا لائبریری رام پور اور نسخۂ ذخیرہ سر سلیمان، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ شامل ہیں۔ نقوی صاحب نے ان نسخوں اور تذکرے کے مطبوعہ نسخوں کو بھی پیش نظر رکھ کر یہ یاد آوری کی ہے کہ نکات الشعرا کی جدید ترتیب و تدوین میں اس کے مختلف قلمی نسخوں بالخصوص نسخۂ انجمن اور نسخۂ رضا رام پور کو اُن کی اہمیت و اعتبار کے پیش نظر کام میں لا کر اس تذکرے کا ایک زیادہ صحیح اور معتبر نسخہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

تیسرے مضمون 'میر اور انعام اللہ خاں یقین' میں یقین کے بارے میں میر صاحب کے ان الزامات کا جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے یقین کی شاعری پر عاید کیے ہیں اور یہ نتیجہ برآمد کیا گیا ہے کہ اُن کی (میر صاحب) انا انھیں اپنے کسی ہم عصر کی برتری تو کجا ہمسری کے اعتراف کی بھی اجازت نہ دیتی تھی، اس لیے انھوں نے کبھی یقین کی سخن فہمی اور موزونِ طبعی سے انکار کر کے اور کبھی انھیں سرقے کا مرتکب قرار دے کر بالارادہ ان کی منزلت کم کرنے کی کوشش کی ہے۔" (ص ۸۱)

چوتھے مضمون میں نقوی صاحب نے مصحفی کے سالِ ولادت کی بابت بحث کی ہے۔ مصحفی کے سالِ ولادت میں بہت اختلاف رائے تھا۔ نقوی صاحب نے مصحفی کے سالِ ولادت کے سلسلے میں اُن کی تصانیف کا گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کر کے نیز دوسرے محققین کی آرا کو جانچ پرکھ کر اس سلسلے میں جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ اُن کی دقتِ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ انھوں نے مصحفی کا سالِ ولادت بھی تقریباً طے کر دیا ہے۔ یہ مضمون کافی دلچسپ مباحث پر مشتمل ہے۔

مصحفی سے منسوب دو تذکرے 'ید بیضا' اور 'نورِ ازل' کے وجود خارجی کی محققانہ طریقے پر تردید کی گئی ہے جنھیں شبیر احمد علوی نے 'مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں' کے عنوان سے نگار لکھنو کے مصحفی نمبر میں متعارف کرایا تھا۔ اس مضمون میں فاضل محقق نے جس طرح سے علوی صاحب کی دلیلوں کی تردید کی ہے وہ اُن ہی جیسے صاحب نظر محقق کا کام ہے۔ مذکورہ دونوں تذکروں کو نقوی صاحب نے 'اُن کے (علوی صاحب) کے ذہن کی اختراع' سے تعبیر کیا ہے۔ اس سلسلے کی بحث بھی قابل مطالعہ اور دلچسپ ہے۔

اس مجموعے کا آخری مضمون 'مصحفی کے ایک عزیز شاگرد شیخ علی بخش بیمار' کے احوال و آثار پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں بیمار کے نام، وطن، تعلیم و تربیت، تاریخ پیدائش، ذوقِ شعر گوئی، تلمذ و تلامذہ و آثار وغیرہ کے سلسلے میں نقوی صاحب نے تحقیق کے نقطۂ نظر سے جو باتیں لکھی ہیں ان سے بیمار کی شخصیت اور شاعری میں ان کے مقام و مرتبے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں بیمار کی شاعری کا ایک انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ اپنے محتویات و مطالب اور طرزِ پیشکش کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ محققین کو متذکرہ موضوعات پر اپنی تحقیقات میں ان سے خاصی روشنی حاصل ہوگی۔ نقوی صاحب کا اسلوبِ بیان صاف و سادہ ہوتا ہے البتہ وہ اپنی ہر بات حوالے اور دلیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور دوسروں کی باتوں کو بھی دلیل و برہان کی روشنی میں ہی دیکھتے ہیں۔ وہ ہماری اردو تحقیق کو اپنی نگارشات سے روز بہ روز مالا مال کر رہے ہیں۔ ہم موصوف کی صحت و سلامتی کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں۔

کتاب بہت عمدہ چھپی ہے۔ سرورق بھی سادہ مگر جاذبِ نظر ہے۔ بیک کور مصنف کی تصویر سے

حزین ہے۔ تحقیق و تنقید سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

سید حسن عباس

تالیفات شیعہ در شبہ قارۂ ہند

تالیف : سید شہوار حسین نقوی امروہوی ہندی

ناشر : دلیل ما، قم (ایران)

حال ہی میں ایران سے فارسی زبان میں شیعہ مولفات و مصنفات کی ایک ببلو گرافی شایع ہوئی ہے۔ اس کے مولف ہماری نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت ہی فعال اور صاحب ذوق ہیں۔ انھوں نے تقریباً دس برس کی محنت شاقہ سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے شایع ہونے والی تقریباً ساڑھے بارہ ہزار کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے جو سترہ زبانوں کی کتابوں سے متعلق ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ کتاب پچاس موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ مولف نے آسانی کے لیے چھ فہرستیں بھی جداگانہ تیار کی ہیں۔

۱۔ کتاب کے نام کے اعتبار سے ۲۔ مولف / مصنف کے اعتبار سے ۳۔ موضوع کے اعتبار سے
۴۔ زبان کے لحاظ سے ۵۔ شہر کے اعتبار سے اور ۶۔ ناشرین کے ناموں کے اعتبار سے۔

مولف نے قیام ایران کے زمانے میں یہ کام شروع کیا تھا۔ وہاں کے مختلف کتاب خانوں میں موجود برصغیر کی کتابوں اور مختلف فہرستوں کی مدد سے یہ کام مکمل ہوا۔ اگرچہ اس کتاب میں کئی خامیاں بھی در آئی ہیں لیکن یکجا طور پر اتنی کتابوں کی فہرست کسی اور کتاب میں نہیں ملتی، اس لیے یہ خامیاں گراں نہیں گزرتی ہیں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ ایسی فہرستوں کو ہر طرح کی خامی سے پاک ہونا چاہیے۔ امید ہے مولف محترم اپنا کام جاری رکھے ہوے ہوں گے تاکہ آیندہ بھی اسی قسم کی کوئی اور فہرست منظر عام پر لاسکیں۔ میں ذاتی طور پر انھیں اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

سید حسن عباس

نقد و اثر (مجموعۂ مضامین)

مصنف : ڈاکٹر شمس بدایونی سنہ اشاعت : جنوری ۲۰۰۳ء

صفحات : ۲۹۰ قیمت : ۲۰۰ روپے ناشر : مصنف

"گزشتہ ربع صدی میں اردو کے جو نئے قلم کار اپنی توانائی قلم، گہری ادبی بصیرت اور علمی صلاحیتوں کے سبب اردو کے تحقیقی و تنقیدی سرمایے میں اضافے کا موجب بنے ہیں ان میں ایک نام شمس بدایونی صاحب کا

بھی ہے (مقدمہ- از ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۵)

بارہ کتابوں کے مصنف اور سیکڑوں مضامین کے مضمون نگار ڈاکٹر شمس بدایونی کے ۱۵ مختلف النوع مضامین جو گزشتہ چودہ پندرہ برسوں کے دوران لکھے گئے تھے اب ایک مجموعے کی صورت میں اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ مضامین غالب و اقبال شناسی سے مصنف کی دلچسپی کے مظہر ہونے کے ساتھ اردو ادب کے کچھ دوسرے مگر اہم موضوعات پر حاوی ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ عہد غالب: تحریک احیاے دین کے پس منظر میں ۲۔ بجنوری بہ حیثیت ناقدِ غالب ۳۔ مجنوں گورکھپوری اور نقدِ غالب ۴۔ قاضی عبدالودود کا رویۂ تحقیق ۵۔ شبلی بہ حیثیت اردو شاعر ۶۔ اقبال کی خامیاں: تعارف و جائزہ ۷۔ کچھ اقبال کے تعلق سے ۸۔ مطالعۂ نگار کی سمت کا تعین ۹۔ ضرب الامثال ۱۰۔ اردو میں مستعمل قرآنی امثال ۱۱۔ بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت (انیسویں صدی میں) ۱۲۔ اردو مثنوی کا آغاز و ارتقا (شمالی ہند میں) ۱۳۔ ملا عبدالقادر کی نو دریافت تالیف ۱۴۔ ہفتہ وار 'چ' لکھنو اور ۱۵۔ اخلاقیات۔

مذکورہ بالا عنوانات سے موضوعات کی گوناگونی کا بھی احساس ہوگا اور اس بات کا اندازہ بھی کہ مصنف کو اردو شعر و ادب کے کئی موضوعات سے نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ وہ ان میں اظہار رائے کی قابلیت کے بھی حامل ہیں۔ اس مجموعے کا ہر مضمون قابل مطالعہ ہے جس میں مصنف نے موضوع سے متعلق اپنے مطالعے کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالبیات سے متعلق تینوں مضامین اسی طرح اقبالیات سے متعلق مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ بدایوں میں تذکرہ نویسی کی روایت، اردو میں مستعمل قرآنی امثال، مطالعۂ نگار، اور ملا عبدالقادر بدایونی کی نو دریافت تالیف 'کشف الغطا فی احوال اصحاب الصفا' (عربی) اور ہفتہ وار 'چ' لکھنو ایسے مضامین ہیں جن میں مصنف نے بھرپور داد تحقیق دی ہے۔ 'اخلاقیات' پر ان کا ایک ابتدائی مضمون بھی قابل مطالعہ ہے۔ ان تمام مضامین میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا طریقۂ استدلال خوب ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی راے 'شمس صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے مرد میدان ہیں۔ انھوں نے اپنے تقریباً تمام مضامین میں تحقیق اور تنقید کے اعلیٰ نمونے پیش کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں شعبے یعنی تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔' (ص ۶)، ان کے لیے نہایت مناسب راے ہے۔

کتاب صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے۔ میں ڈاکٹر شمس بدایونی کو اُن کی اس نئی کتاب کی اشاعت پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ اہل علم اس کی پذیرائی کرنے کے ساتھ اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

سید حسن عباس

شیخ محمد علی حزیں – حیات و کارنامے

تالیف : پروفیسر شمیم اختر (شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

سنہ اشاعت : ۲۰۰۳ء صفحات : ۵۲۸

طباعت : ناردن آفسیٹ پریس لکھنو قیمت : ۴۰۰ روپے

شیخ علی حزیں لاہیجی فارسی کے صاحب دیوان نامور شاعر، تذکرہ نویس اور عالم دین گزرے ہیں۔ اُن کی شخصیت اور شاعری محتاج تعارف نہیں بلکہ بارہویں صدی کے تقریباً ہر فارسی تذکرے میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ و فارسی کے کثیر التصانیف شاعر و ادیب ہیں۔ ان کے شاگرد بھی صاحب دیوان تھے۔ اس مبسوط کتاب سے قبل ارد میں دو چار مختصر رسالے/کتابچے ضرور شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، دوسرا منشی غلام حسین آفاق بنارسی کے علاوہ ایک دو رسالے اور میرے علم میں ہیں۔ مصنفہ نے اول الذکر دونوں رسالوں سے اپنی تحقیق میں استفادہ کیا ہے۔ ابھی حال میں ڈاکٹر عارف نوشاہی نے رقعات حزیں اور ایک فارسی رسالہ دریافت کرکے تہران سے شائع کرایا ہے۔ اس سے قبل استاد محترم ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کدکنی (دانشگاہ تہران) نے حزیں کے بارے میں ایک کتاب 'شاعری در ہجوم منتقدان' کے نام سے تہران سے شائع کی تھا۔ اس میں حزیں کے احوال و آثار سے متعلق جو باب شامل ہے اس کا میں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو فکر و تحقیق دہلی کے جنوری-مارچ ۲۰۰۳ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

زیر تبصرہ کتاب 'شیخ محمد علی حزیں – حیات و کارنامے' مصنفہ پروفیسر شمیم اختر کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقال ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ ایران کا تاریخی و ادبی پس منظر عہد صفوی میں ۲۔ حزیں ایران میں ۳۔ ترک وطن کے اسباب ۴۔ حزیں ہندوستان میں ۵۔ معارضۂ حزیں و ہندیاں ۶۔ حزیں کی نثری تصانیف ۷۔ قصیدہ گوئی، غزلیات حزیں، مثنوی نگاری۔ واضح رہے کہ اس سے قبل مصنفہ کے دو مجموعۂ مضامین 'بوستان ادب' اور 'اوراق پریشاں' منظر عام پر آچکے تھے۔

اس کتاب میں مصنفہ نے حتی المقدور داد تحقیق دی ہے۔ صاف و سادہ اسلوب میں اپنی بات کہی ہے۔ حزیں کے آثار کی ایک فہرست بھی شامل کتاب ہے اور حزیں کی شاعری نیز نثر نگاری پر سیر حاصل بحث کرنے کے ساتھ 'معارضۂ حزیں و آرزو' کے باب میں بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن جہاں اس ادبی معرکہ کے موق اور مخالف رسالوں کا ذکر آیا ہے وہاں وارستہ سیالکوٹی[1] کے ایک رسالے 'جواب شافی' کا ذکر تو کیا گیا ہے جس کا موضوع سے کوئی خاص ربط نہیں تھا لیکن وارستہ کا جو رسالہ موضوع سے براہ راست مربوط تھا اُس کا ذکر نہیں آسکا اور

اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مصنف کو وہ رسالہ کہیں نہیں مل سکا ہوگا۔ یہ رسالہ 'احقاق حق' ہے جس میں شیخ حزیں کے اشعار پر خان آرزو کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اب وارستہ کے یہ دونوں رسالے 'جواب شافی' اور 'احقاق حق' طبع ہو چکے ہیں۔ (اول الذکر تہران سے اور موخر الذکر دہلی سے)

بہر حال مصنف نے موضوع سے متعلق تمام جزئیات کا احاطہ کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ بیک کور پر حزیں کی تصویر بھی شایع کی گئی ہے۔ امید ہے یہ کتاب فارسی ادبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

سید حسن عباس

مقالات غنی (مجموعۂ مقالات)

ڈاکٹر محمد عثمان غنی (لکچرر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

سنہ اشاعت	:	۲۰۰۴ء	صفحات	:	۱۹۳
ناشر	:	مصنف	طباعت		لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ

زیر نظر مجموعۂ مقالات ڈاکٹر محمد عثمان غنی کا پہلا مجموعۂ مقالات ہے جس میں درج ذیل ۱۰ مقالات شامل ہیں :

۱۔ کلام غالب کے فکری عناصر
۲۔ مثنوی چراغ دیر غالب کے فکروفن کے تناظر میں
۳۔ نظیری ۔ ایرانی شعری روایت کا علمبردار
۴۔ سبک ہندی کا آغاز وارتقا
۵۔ تاج محل — ایک تعارف
۶۔ فارسی تحقیق وتنقید میں علی گڑھ کا حصہ
۷۔ مغل مصوری
۸۔ فغانی اوران کا اسلوب
۹۔ درد و داغ — ایک تجزیاتی مطالعہ
۱۰۔ ایرانی فنون لطیفہ

جیسا کہ مذکورہ فہرست سے پتا چلتا ہے، تین مقالے غالب سے متعلق ہیں جس سے مصنف کی غالب اور مطالعۂ غالب سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تاج محل، مغل مصوری اور ایرانی فنون لطیفہ کے موضوع پر مصنف نے جس طرح قلم اٹھایا ہے اسے دیکھتے ہوئے نئے موضوعات کی جستجو کی طرف توجہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ فارسی تحقیق وتنقید میں علی گڑھ کا حصہ، ایک مستقل موضوع ہے جس پر ریسرچ کا کام کیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے اپنے مقالے میں سرسید احمد خاں، حالی، شبلی، خسرو سوسائٹی، پروفیسر ہادی حسن، ضیا احمد بدایونی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر نبی ہادی، پروفیسر وارث کرمانی، کبیر احمد جائسی اور پروفیسر سمیع الدین احمد کے علمی اور تحقیقی کارناموں سے اپنے قارئین کو متعارف کرایا ہے جو ایک مستحسن قدم ہے۔ ضرورت ہے کہ ان اور ان جیسے دیگر اصحاب تحقیق و

تنقید کے علمی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ ڈاکٹر عثمان غنی کی اس علمی کوشش پر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے علمی کاموں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر آزرمیدخت صفوی (شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے بھی جو ہمیشہ اپنے چھوٹوں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتی ہیں، ڈاکٹر عثمان سے یہی توقع کی ہے۔ کتاب اچھی چھپی ہے اور مصنف سے طلب کی جا سکتی ہے۔

سید حسن عباس

شامِ غریباں (مراثیِ ارشاد)

شاعر : تقی احمد ارشاد صفحات : ۲۲

پیشکش : ڈاکٹر نثار احمد سنہ اشاعت : درج نہیں لیکن یہ کتابچہ ۲۰۰۶ء میں طبع ہوا

ناشر : اِرم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ۔۴

تقی احمد ارشاد نبیرۂ شاد عظیم آبادی عصر حاضر کے بزرگ ادبا و شعرا میں ہیں۔ آپ نے شاد عظیم آبادی کی تصانیف کی اشاعت کے علاوہ خود شاد کے بارے میں متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ 'زبور اخلاق' (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) میں ارشاد کے پانچ مراثی شامل تھے۔ دو مرثیے زیر تبصرہ مجموعے میں شامل کیے گیے ہیں۔ دو مرثیے 'مراثیِ شاد' (مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، ۱۹۹۱ء) میں شامل تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر ارشاد نے اب تک ۹ مرثیے کہے ہیں۔ ارشاد کا ایک مرثیہ میں نے رسالہ ادراک شمارہ ۲ (۲۰۰۴ء) میں شایع کیا تھا جو اس مجموعے میں بھی شامل ہے۔ ایک مرثیہ 'شام غریباں'، ۱۱ راگست ۲۰۰۵ کو تکمیل ہوا۔ زیر تبصرہ مجموعہ میں درج ذیل دو مرثیے پیش کیے گیے ہیں:

۱۔ شام غریباں ، مطلع : نت نئی شام الم شام غریباں لائی ۳۹ بند

۲۔ دراحوال امام حسینؑ ، مطلع : کربلا تیرے شہیدوں، ترے مشہد کو سلام ۲۹ بند (مطبوعہ ادراک)

تقی احمد ارشاد نے مرثیہ گوئی میں شاد عظیم آبادی کے اصولوں اور نقش قدم پر چل کر روایات صحیحہ کے مطابق مرثیہ گوئی کا عمل انجام دیا ہے۔ ان کا تاریخ اسلام اور قرآن کریم کا مطالعہ بھی پوری طرح ان کے مرثیوں میں اُجاگر ہوا ہے۔ اپنے تحقیقی مقالے 'بہار میں اردو مرثیہ' پر میں نے ان پر تفصیل سے لکھا ہے۔

اعجاز احمد نے 'سید تقی احمد ارشاد – ایک نظر میں' مختصراً ارشاد کے سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعے کے آخر میں جناب عاشور کاظمی کی کتاب 'اردو مرثیے کا سفر' میں شامل ارشاد کی مرثیہ گوئی سے متعلق تحریر کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مجموعہ دیدہ زیب ہے۔ یہ مجموعہ ڈاکٹر نثار احمد 348, M.I G. کنکر باغ، پٹنہ (بہار) سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سید حسن عباس

فکر، فن، فنکار

مصنف : حسن مثنیٰ صفحات : ۲۲۴

ناشر : ایلیا پبلی کیشنز، دہلی قیمت : ۲۰۰ روپے

زیرِ تبصرہ مجموعۂ مضامین ڈاکٹر حسن مثنیٰ کی تیسری پیش کش ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں 'مجتبیٰ حسین اور فنِ مزاح نگاری' اور 'ادیب محقق صحافی — چودھری سید محمد نقوی' حلقۂ ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

۲۲۴ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں پندرہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو بالترتیب اس طرح ہیں خطوط غالب میں ان کے عہد کا سیاسی و سماجی کرب / مراثیٔ انیس میں رزمیہ عناصر / مراثیٔ انیس کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی جائزہ / مراثیٔ دبیر میں فارسی الفاظ و تراکیب / علامہ جمیل مظہری کی عشقیہ شاعری / رجعت میں شب تاریک ہجران کون دیکھے گا / منٹو: ایک اخلاقی محتسب / تصورات و احساسات کا شاعر میراجی / فکر تونسوی کی طنز نگاری / ادب کا بھیشم پتاما بھیشم ساہنی / نغمہ و ترنم کا شاعر: قتیل شفائی / کیفی اعظمی شخص اور شاعر / حق کا متلاشی امن کا پیامبر علی سردار جعفری / سرمئی کبوتر یا شاہین ادب، رفعت سروش / علی باقر کے افسانوں میں نسوانی رشتے اور جذبات۔

یہ 'تمام مضامین ملک کے موقر جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں یا سے می ناروں میں پڑھے جا چکے ہیں (ص ۱۱)'۔ میرے خیال میں یہ مضامین اردو شعر و ادب کے جن موضوعات پر مشتمل ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف نے حتی الامکان جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے ان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان و بیان بھی صاف و سادہ ہے۔ اردو ادب کے شائقین بالخصوص طلبا کے لیے یہ کتاب بہت مفید اور قابلِ مطالعہ ہے۔

کتاب کی قیمت صرف دو سو روپے ہے جو ایلیا پبلی کیشنز، نئی دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

خدا کرے ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا یہ مجموعۂ مضامین اُن کی سابق کتابوں کی طرح حلقۂ ارباب ادب میں قبولیت حاصل کرے۔

سید تقی عباس کیفی گوپال پوری

ذکرِ نادم بلخی

ترتیب : ڈاکٹر سید حسن عباس صفحات : ۲۹۸+۱۱

سالِ اشاعت : ۲۰۰۵ء ناشر : مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور

پروفیسر نادم بلخی کی شخصیت اردو داں حلقے میں محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، محقق، ناقد، عروض داں اور استاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ ایک مخلص اور نیک دل انسان

ہیں۔ ان کی وضع داری آپ اپنی مثال ہے۔ ('پروفیسر نادم بلخی - احوال و اثار'، از ڈاکٹر سید حسن عباس، مشمولہ 'ذکر نادم بلخی'، ص ۱۱۹)۔

'ذکر نادم بلخی' اسی ہمہ جہت شخصیت کی حیات اور خدمات پر مشاہیر ادب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر سید حسن عباس (شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی) اور ناشر مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپالپور، سیوان (بہار) ہے۔ ڈاکٹر سید حسن عباس یقیناً تحسین و ستائش کے حقدار ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کر کے ایک عہد ساز شخصیت کی تاریخ محفوظ کر دی۔ ۵۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کا پہلا باب بلخی صاحب پر مشاہیر کے تاثرات اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا باب ہے۔ اس میں خود بلخی صاحب کے مضمون 'کچھ اپنے بارے میں' کے علاوہ پروفیسر مختار الدین احمد، مظہر امام، احمد یوسف، مجور رشی، قیوم خضر، ڈاکٹر سید حسن عباس، ذکی احمد، ظہیر غازی پوری، بشتی مخذن، ڈاکٹر منظر حسین، آزاد گورداس پوری، ڈاکٹر شبیر احمد اور اوج اکبر آبادی کے مضامین' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جس میں انہوں نے بلخی حضرات کی تاریخ، ان سے اپنی واقفیت اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔

اگلا باب بلخی صاحب مرحوم کی شاعری سے متعلق ہے۔ چونکہ بلخی صاحب تقریباً ہر صنف سخن پر یکساں قدرت اور خاصا شعری سرمایہ رکھتے ہیں، لہٰذا اس باب کو بہ اعتبار اصناف شعر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ شکیل بدایونی، عبدالقوی دسنوی، احمد یوسف، عتیق احمد عتیق، ڈاکٹر شعیب راہی، مناظر عاشق ہرگانوی، حسین الحق، ظفر ہاشمی، حبیب اللہ، وغیرہ مشاہیر ادب نے جہاں ان کی غزل گوئی اور مجموعوں کے جائزے پر زور قلم صرف کیا ہے، وہیں ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی اور ڈاکٹر سید حسن عباس نے ان کی غزلوں میں کربلائیت کو اپنا موضوع بنایا ہے جو یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے بعد بالترتیب بلخی صاحب کی نظم نگاری، رباعی گوئی، نعت گوئی، دوہا نگاری، ھائیکو نگاری، ماہیا نگاری، سانیٹ نگاری، پہیلی گوئی، کہ مکرنی گوئی اور تاریخ گوئی پر مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاعری کے بعد بلخی صاحب کی ادبی شخصیت کے دوسرے گوشوں پر مضامین کا باب شروع ہوتا ہے جس میں پروفیسر احمد سجاد کا مضمون 'نادم بلخی، ایک محقق نقاد' قابل ذکر ہے۔ بلخی صاحب کی عروض دانی پر شارق جمال ناگپوری مرحوم نے خامہ فرسائی کی ہے۔ حال آں کہ یہ مضمون دراصل بلخی صاحب کے مجموعہ کلام 'دوپہر کا دائرہ' کا عروضی تجزیہ ہے تاہم اس سے بلخی صاحب کی عروض میں مہارت پر خوب خوب روشنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ بلخی صاحب کی تصنیف 'تفہیم العروض' پر اس کتاب میں کوئی مضمون شامل نہیں تاہم شارق جمال صاحب کے مضمون سے کچھ حد تک اس کی تلافی ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بلخی صاحب کی صحافت پر ڈاکٹر سید حسن عباس کا مضمون بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ نجمی صاحب کے نام پروفیسر مختار الدین احمد کے پانچ مکاتیب بھی شامل کیے گیے ہیں۔ ہر چند کہ تعداد میں یہ صرف پانچ ہیں تاہم ان پر ڈاکٹر سید حسن عباس کے حواشی نے ان کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مکاتیب کے بعد ان کی سوانح نگاری پر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اور قاضی عبد الہادی کے علاوہ محترم علامہ صابر قادری صاحب کا مضمون 'دلچسپ کہانی ان کی ایک ادبی سرمایہ' نجمی صاحب کی سوانح نگاری کا آئینہ دار ہے۔

اس کتاب میں نجمی صاحب کے انٹرویوز کے علاوہ ان کی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے گیے ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب میں جا بجا مشاہیر ادب کے خطوط سے اقتباسات بھی شامل کیے گیے ہیں اور منظوم خراج عقیدت بھی۔ اس کتاب میں دیوناگری رسم الخط میں مشاہیر ادب ھندی کے پانچ مضامین بھی شامل ہیں۔ آخر میں چند تصویریں شایع کی گئی ہیں جو نجمی صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کی عکاس ہیں۔

کتاب کی طباعت، کتابت اور گیٹ اپ عمدہ ہے۔ قیمت بھی ۳۰۰ روپے مناسب ہے۔ ڈاکٹر مظفر نجمی کنڈ محلہ، ڈالٹن گنج (پلاموں، جھارکھنڈ) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

سید تقی عباس کیفی گوپال پوری

◆

احوال و آثار میر غلام علی آزاد بلگرامی

مصنف : سید حسن عباس

بارہویں صدی کے معروف شاعر و ادیب میر غلام علی آزاد بلگرامی کی زندگی اور علمی کارناموں پر مشتمل مصنف کا دانشگاہِ تہران نے فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ جسے انتشاراتِ محمود افشار نے ساڑھے چار سو صفحات میں شایع کیا ہے۔

پروفیسر محمد ناظر صدیقی
رئیس بخش فارسی، دانشگاہ بی آر امبیدکر، بہار
مظفر پور

خواجہ میر درد از حیث رباعی گوی فارسی

درمیان قالبهای شعر، رباعی قالبی معروف محسوب می شود۔ بسیار شاعران ہستند کہ در این قالب داد سخنوری دادہ اند، ابوسعید ابوالخیر نخستین شاعری است کہ رباعی را وسیلہ ترجمانی مسائل تصوف قرار دادہ است۔ در این شیوہ از شاعری کسانی چون رومی، جامی و سنائی و غیرہ شعر سرودہ اند۔

خواجہ میر درد کہ سخنوری ہندی نژاد است این قالب را در ہند بسیار کمال و جمال بخشید و خزینہ اسرار و رموز تصوف قرار داد۔ وی بہ زبان اردو ہم رباعیہ سرودہ است، اما تمام توجہ خویش را صرف رباعی گوئی فارسی نمودہ است۔ در دیوان فارسی درد پانصد و چہل رباعی بہ چشم می خورد۔ این کثرت رباعیاتش شاہدی است بر اینکہ خواجہ از این قالب شعر لذت می بردہ است۔ و افکار و خیالات عالی خودش و حقائق و معارف را بوسیلۂ این قالب اظہار دادہ است۔

از حیث جامعیت خواجہ در سخنوری متصوفانہ بسیار معروف بہ شمار می آید۔ سودا، میر، میرزا مظہر جانجانان و یقین ہمہ معاصرین خواجہ اند، و ایشان نیز رباعی سرودہ اند، اما آن چاشنی زبان و افکار متصوفانہ کہ در رباعیات خواجہ بہ نظر می خورد، در رباعیات دیگران دیدہ نمی شود۔ می بینیم کہ این صنف بر بنای ساخت فکری، موضوعی خودش سودا را ہم مجبور کرد کہ وی ہم رباعی می سراید، اما چونکہ تصوف سرمایہ حیات خواجہ بود، رباعیاتش از سرتا پا غرق در تصوف است۔ شہرت رباعی برای بیان مسائل اخلاقی است و اخلاق نیز جزئی از تصوف است۔ بنا بر این شاعرانی کہ اخلاق را موضوع سخن خویش قرار می دہند خواہ و ناخواہ در حیطۂ تصوف در خواہند آمد۔

چنانکہ ذکر شدہ کہ خواجہ در ہر دو زبان اردو و فارسی رباعی سرودہ است، اما رباعیات اردوی وی ہمچون رباعیات فارسی او زیبا و جالب نیست۔ رباعیات فارسی خواجہ از حیث فکری و فنی بر اوج آسمان است، بہ سبب اینکہ عمدہ ترین نمونہ کلام است دین قدیم این قالب نزد خواجہ بودہ اند۔ من فکری کنم کہ ہمین سبب خواجہ

در این نوع از شعر این چنین مهارت پیدا کرد. در اینجا دیدگاه بعضی از تذکره‌نویسان بیان می‌کنم تا مقام خواجه میر درد در رباعی‌گوئی فارسی مشخص شود. مثلاً خان آرزو می‌گوید

"فارسی هم خوب می‌گوید، بزبان فارسی رباعی اکثر می‌گوید."[1]

شوق رامپوری در "جام جهان‌نما" می‌نویسد

"شعر هندی و فارسی متصوفانه خوب می‌گفت، اکثر رباعیات در تصوف موزون کرده. از آن چاشنی درویشی واضح و لائح می‌گردد، رساله نالهٔ درد، و "آه سرد" در سلوک خوب گفته."[2]

یکتا رامپوری در "دستور الفصاحت" می‌نویسد:

"شعر فارسی آن وحید عصر هم به نسبت میر و میرزا ممتاز است علی الخصوص رباعیات."[3]

میر تقی میر در "نکات الشعراء" می‌گوید

"شعر فارسی هم می‌گوید، اما بیشتر رباعی گوئی باز از وسعت مشرب اوست."

قائم در تذکرهٔ خویش می‌نویسد که

"رباعیات بطور سحابی و خیام بسیار دارد."[4]

حق این است که اگر این تذکره‌نگاران ذکر شده هم بر خوبی رباعیات فارسی خواجه دلالت نکنند، باز هم رباعیاتش در نگاه معنی آشنایان از حیث وسعت فکر و کمال فن قابل تحسین است. چونکه عهد شاعران رباعی‌گوی فارسی مختلف بوده، بنابراین موازنه و مقایسه خواجه با آنان ممکن است. از اینجا به عنوان مسائل تصوف با کلام رباعی‌سرایان معروف دوره‌های مختلف رباعیات خواجه را می‌سنجم تا آشکار شود که محاسن فنی و معنوی رباعیات خواجه در چه قرار است.

به عنوان توحید و معرفت عمر خیام می‌گوید:

قومی متفکرند در مذهب و دین جمعی متحیر اند در شک و یقین
ناگاه منادی برآمد ز کمین کای بی‌خبران راه نه آنست و نه این

جامی می‌گوید

عالم همه فغان لا اله الا هوست جاهل گمان که دشمن است این یا دوست
دریا بوجود خویش موجی دارد خس پندارد که این کشاکش با اوست

عبدالقادر بیدل می‌گوید

هر سایه به شخصی باز اگر دید چه شد در عکس ز جلوه دور بالید چه شد

حق از عدم و وجود ما مستغنی ست — خورشید اگر شعاع فهمید چه شد

صائب می گوید

صفای روی ترا از نقاب می بینم — به ماه می نگرم آفتاب می بینم

نژاد گوهر من از محیط یکسان ست — بیک نظر همه را چون حباب می بینم

شیخ علی حزین می گوید

ای مطرب عاشقان نوای تو کجا است — ای ساقی جان آب بقای تو کجا است

گیرم دل ما از نظرت افتاده ست — گیرایی مژگان رسای تو کجا است

خواجه میر درد میگوید

اشک مردم فزوده ایقان مرا — جهل دگران گشوده عرفان مرا

این سستی اعتقاد ابنای زمان — مستحکم تر نموده کی ایمان مرا

امکان که سراسرست معروف به عیب — شد محو کمالات و خوبی لاریب

هر چیز که پیدا ست بجنبش پیداست — آورده شهادت همه ایمان بالغیب

درخلوت ما که رشک صد انجمن است — با خویش زبان چو شمع گرم سخن است

عالم آیینه خانه است درد را — هر سو که اشارت است با خویشتن است

دربیان توحید و معرفت، چند رباعی از شاعران دیگر که با رباعیات خواجه میر درد تذکر داده شد، با مطالعه آن، این حقیقت بطور کلی آشکار می شود که خواجه در رباعیات خویش به توضیح و تشریح افکار خویش پرداخته که در رسائل اربعه، مانند "رساله نالهٔ درد"، "رساله آه سرد"، "رساله درد دل"، "رساله شمع محفل" بیان داشته است۔ علاوه بر رباعیات، تقریباً تمام اشعار وی هم رنگ تصوف دارند۔ چند غزلها که درین رساله نیست، تعدادش کم است۔ اما تقریباً همه رباعیات خواجه دراین رساله نیست، تعدادش کم ست۔ اما تقریباً همه رباعیات خواجه دراین رساله بچشم می خورد۔ کمال شاعری خواجه اینست که مسائل فکر و فلسفه هم بطور عاشقانه و رندانه بیان شود۔ رباعیاتش از اول تا آخر همه مسائل تصوف است، لیکن رندانه و عاشقانه خواجه هم از تاثیر

تصوف بوجود آمده، تصور عشق‌شان اصلاً تفسیر عشق حقیقی است. لذا این تصورات خواجه ترجمان همین نظریه هم است که برخلاف عقلیت، راه روحانی را وسیله ادراک حقیقت قرار بدهد. خواجه نیز رباعیات را که در آن اعتراف نارسایی و گمراهیهای عقل کرده شده است و پس آن رباعیات را هم مشاهده باید کرد. در آن عشق را باعث اصل کائنات، حقیقت کائنات، آئین کائنات، وسیله معرفت و فضیلت انسانی قرار داده است. این هر دو تصور به هم مربوط است، عشق محض، عشق مجازی نیست، بلکه قوت تخلیقی حیات و کائنات هم است و مقام بلند و بالای معرفت هم. اصلاً همین عشق است که نفی عقل می‌کند. لذا از دید خواجه مانند دیگر صوفیان مخالفت عقل روش منفی نیست، بلکه در آن معنی یک رجحان مثبتی است. زیرا که او در میدان ادراکیت و تشکیک نمی‌کند و راه را از آن تاریکی بیرون آورده و از ثبات عشق روشن می‌کند و نوری می‌بخشد. در شعر خواجه شراب هم شراب عشق است، و میخانه هم و چه محبوب به شمار می‌رود. همه متعلقات می و میخانه هم مظاهر عشق و معرفت است. در زیر عنوان "عقل و عشق" رباعیات خواجه را با رباعیات دیگران مقایسه می‌کنم تا مقام خواجه روشن شود.

عطار می‌گوید

عقلی که رهبر خود ساختمش | در معرفت خدای بگداختمش
عمرم برسید تا بدین عقل ضعیف | بشناختم این قدر که نشناختمش

اوحدی مراغه‌ای می‌گوید

ای جان بموافقت سراندازی کن | ای دل تو در این وقت هم سازی کن
ای صبر تو تاب غم نداری بگریز | ای عقل تو کودکی برو بازی کن

جامی می‌گوید

ای دل طلب کمال در مدرسه چند | تکمیل اصول و حکمت و هندسه چند
هر فکر که جز ذکر خدا وسوسه است | شرمی ز خدا بدار، این وسوسه چند

خیام می‌گوید

کس را پس پرده قضا راه نشد | وز سر خدا هیچ کس آگاه نشد
هر کس ز سر قیاس چیزی گفتند | معلوم نگشت و قصه کوتاه نشد

شیخ علی حزین می‌گوید

هر چند که حسن و عشق مستور به است | آیات نیاز و ناز مشهور به است

هر سینه که داغ نیست خشت لحد است / زان لب که نالید لب گور به است

سحابی می گوید:

دل مسکن عشق است نه ماوای عقول / چون خانهٔ عقل ساختی گشت ملول
تحقیق بدان که زود ویران گردد / هر خانه که غیر صاحبش کرد نزول

غنی کشمیری میگوید:

بی فهم اگر چشم بدوزد بکتاب / نتواند دید روی معنی در خواب
کی غور کنند در سخن بی مغزان / غواصی بحر نیست مقدور حباب

خواجه میر درد میگوید

ای کرده خراب عمر در چون و چرا / عارف نشدی اگرچه گشتی ملا
از ما بجز اقبال نه بینی گاهی / هرچند که ایراد نمائی برما
ای کرده تمام عمر در بحث خراب / یک نکته خاموشی است صد گونه کتاب
زین پیش باهل ذوق ابرام مکن / دیگر چه سوال است که داریم جواب
ادراک مرا دعوت بیدائی کرد / فریاد که رسوائی شناسائی کرد
زین پیش نداشتم دماغ صحبت / ظلم است که این انجمن آرائی کرد

آوردن مضامین رندانه در شعر فارسی بر شمرهٔ همین طریق عاشقانه وخلاف عقل است. معمولاً همه شعرای فارسی این مضامین را بکار برده اند، اما در غزل حافظ و در رباعیات عمر خیام مضامینی که آنها جامهٔ شعر پوشانیده اند، کسی دیگر از شاعران فارسی این کار را نتوانسته است. در این خصوص با خیام، خواجه را ببینید که چقدر مهارت وصلاحیت شعری خودش را بروی کار آورده است

خیام میگوید

گر می نه خوری طعنه مزن مستان را / گردست دهد توبه کنم یزدان را
تو فخر بدین کنی که من می نخورم / صد کار کنی که می غلام است آنرا

خوش باش که عالم گذران خواهد بود / روح از پی تن نعره زنان خواهد بود
این کاسهٔ سرها که تو بینی یک چند / زیر قدم کوزه گران خواهد بود

خواجه میر درد میگوید

در میکده از بسکه فراغ است بسی — آزاد شود هر که نشیند نفسی
ای درد به بست هیچ کس دست سبو — زنجیر به پای غم نکرد دست کسی
ساقی بخراشیدهٔ دام تو ایم — سودازدهٔ زلف سیه فام تو ایم
ماندهٔ بی درهم و بی دام تو ایم — آزادهٔ خلق او بستهٔ دام تو ایم

از رباعیات خیام آشکار می شود که افکار رندانه، درد از عشق و معرفت، نشه و مستی کم پیدا هم چند که در اشعار خواجه میر درد جبر نیز احساس می شود، مثلاً:

مجبور حقیقتیم به گفتن مختار

اما چنانکه متذکر شده ام، خواجه قایل جبر مطلق است، اختیار کلی را اعتراف می کند، بلکه در نظر او جبر و اختیار هر دو بصورت اضافی هستند، لذا احساس جبر، خواجه را مایوس نمی کند، بلکه بوسیله مژدهٔ وصال محبوب حقیقی آنرا امید می نوشاند. مقام فنا، انتهای وحدة الوجود است، ولی این فنا، اصلا فنا نیست، بلکه پیش خیمه بقا است. ابتدا و انتها هر دو در بحر وجود گم می شوند. مستی صوفی، مستی فنا است و علاوه برین آیینه دار احساس هم هست. شعر میر درد پر از زندگی است، او انسان را مجبور محض نمی شمارد، بلکه انسان، نزد میر درد احسن تقویم، خلاصه کائنات و مظهر صفات حق است.

فلسفه تصوف، آن تصور عظمت انسانی را بوجود آورد که پیش از آن نبوده. شعرای رباعی گوی فارسی این موضوع را هم بکار برده اند و توجه خاصی صرف نموده اند. ببینید میر درد را که مانند رباعی گوی دیگر این مضامین را چطور در رباعیات خویش بکار برده است

ابوسعید میگوید

آن وقت که این انجم و افلاک نبود — وین آب و هوا و آتش و خاک نبود
اسرار یگانگی سبق می گفتم — این قالب و این نوا و دراک نبود

خیام میگوید

مقصود ز جمله آفرینش ماییم — در چشم خرد جوهر بینش ماییم
این دایرهٔ جهان چو انگشتری است — بی هیچ شکی نقش نگینش ماییم

جامی میگوید:

گر در دل تو گل گذرد گل باشی — ور بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است اگر روزی چند — اندیشهٔ کل پیشه کنی، کل باشی

ردی میگوید:

خواهی که در این زمانه فردی گردی — یا در ره دین صاحب دردی گردی
این را بجز از صحبت مردان مطلب — مردی گردی چو گرد مردی گردی

خواجه میر درد میگوید

پژمرد گل جهان ز پژمردن ما — افسرد دل خلق ز افسردن ما
ما باعث اعتبار عالم بودیم — دنیا گردید هیچ از مردن ما

انسان که جناب او جناب عالی است — ای درد عجب درگه فارغ بالی است
در بزم خیال او که رشک خلد است — چون آئینه جای هر که آمد خالی است

انسان که اخیر شد ز حیوان و نبات — اسفل گردید از همه موجودات
حاصل ز تنزل شده بود غیر عروج — حق را خوانی اگر رفیع الدرجات

از مطالعهٔ رباعیات مذکوره بخوبی آشکار است که رباعیات میر درد کاملاً مرز عظمت فکر است، بر دل میر درد توحید حاکم بود، بنابرین مطالب رباعیاتش بیشتر بر آن محور گردش می کند۔ این رباعیات میر درد عمده ترین نمونهٔ آمیزش فکر و فن است۔ حقایق و معارف با بصیرت حکیمانه بیان شده است۔ انداز بیانش شگفته، موثر و دلنشین است۔ بنابرین میتوان گفت که میان شعرای متاخر، بعد از میرزا عبدالقادر بیدل، خواجه میر درد، بزرگترین شاعر رباعی گوی عهد خود است۔ و رباعیات او صنف رباعی را بسیار غنی کرده است۔

حواشی

1. جام جهان نما - شوق رامپوری
2. دستور الفصاحت - یکتا رامپوری
3. نکات الشعراء - میر تقی میر
4. مخزن نکات قائم چاندپوری
5. قدیر احمد - خواجه میر درد اور ان کا ذکر و فکر
6. وحید اختر - خواجه میر درد اور تصوف

پروفیسر ڈاکٹر حافظ شبیر احمد حیدری
صدر شعبۂ فارسی، لنگٹ سنگھ کالج،
مظفر پور

سرخوش کے عہد کا سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول

ہندوستان میں مغلوں کی حکومت جس کی بنیاد بابر (متوفی ۱۵۳۰ عیسوی) کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اکبر (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ عیسوی) کے عہد میں ایک پرشکوہ اور باوقار حکومت کی شکل میں وجود میں آئی۔ جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ عیسوی) نے باپ کے اس شاندار ورثہ کو اپنی منظم حکمرانی اور دوراندیشی سے اس وقت دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

جہانگیر کی وفات کے بعد ۱۰۳۷ھ میں اس کا لڑکا خرم، آصف خاں کی مدد سے سریر آرائے سلطنت ہوا اور شاہجہاں کے لقب سے مشہور ہوا۔ شاہجہاں کی حکومت کی مدت تیس سال ہے اور اس کے عہد حکومت کو ہندوستان میں مغلوں کا دور زریں کہا جاتا ہے۔ اس وقت سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ اس کے عہد میں سارے راجواڑے اور مسلم ریاستیں یا تو مفتوح ہوئیں یا اس کے تابع ہو گئیں۔ شاہجہاں نے جلد ہی داخلی شورشوں اور بغاوتوں کو (جیسے جھجھر سنگھ اور خان جہاں لودی کی بغاوتیں) فرو کر دیا۔

اس کے علاوہ سرزمین دکن کو بھی زیر فرمان کرنے میں اس کو کامیابی ہوئی لیکن قندھار کے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے شاہجہاں نے جو مکرر اقدامات کئے اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ہندوستان سے باہر جو جنگ اس عہد میں لڑی گئی اس میں ایک بلخ کی مہم تھی۔ ۱۰۳۲ھ میں شاہجہاں نے بلخ کے حکمراں کو شکست دے کر اسے اپنے زیر تابع کر لیا۔ اگرچہ اپنے طرز حکومت اور انصرام سلطنت میں شاہجہاں نے کسی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت نہیں دیا لیکن جہانگیر کے آخری عہد میں ملک کی انتظامی اور مالی حالت میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اس کی اصلاح کے لئے ضروری اقدامات کئے۔ اپنے آغاز حکومت میں شاہجہاں ذاتی طور پر ملک کے انتظام و انصرام میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے یہ ذمہ داری اپنے امیروں اور وزیروں کے سپرد کر دی اور اپنے بیٹوں کو مختلف صوبوں کا گورنر بنا دیا۔ اس نے منصب داری نظام کو بڑی حسن اسلوبی سے درست اور استوار کیا اور اس ضمن میں ضروری قوانین

نافذ کیے۔ علاوہ اس کے منصب داروں کے وظائف اور تنخواہ میں کمی کر کے انہیں مجبور کیا کہ وہ سپاہیوں کی مقررہ تعداد سے زیادہ سپاہی اپنے اختیار میں نہ رکھیں۔[2] اس طرح ملک کی مالیات میں اضافہ ہوا۔

شاہجہاں نے یورپ اور دوسرے ہمسایہ ممالک سے بہترین سیاسی روابط قائم کیے جس سے اس کی دانشمندی اور مصلحت بینی کا پتہ چلتا ہے اس نے بھی اپنے ہم عصر ایرانی بادشاہوں مثلاً بادشاہ صفی اور شاہ عباس سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کیے۔ اس کے زمانہ میں سلطنت مغلیہ اپنی شان و شوکت، جاہ و جلال اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اکبر نے جس عظیم اور پائیدار سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس عہد میں پایہ کمال کو پہنچ گئی۔ اس وسیع سلطنت میں ہر طرف امن و امان سکون و استقلال اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد کا ہندوستان ایک عظیم اور مرفہ الحال مملکت کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ شاہجہاں کے وزراء، آصف خاں اور سعد اللہ خاں نے اپنی بیدار مغزی اور دور اندیشی سے ملک کو مزید ترقی کی شاہراہ پر لگایا اس سے ملک کی آمدنی اور خوشحالی میں اضافہ ہوا۔

ملک میں چونکہ ہر طرف امن، امان اور آسودگی کا دار دورہ تھا۔ اس سے اس عہد کی تجارت کو بھی بہت فروغ ہوا۔ اور اس نے غیر ملکی تجارتی توجہ کو اپنی طرف منعطف کیا۔ ان کے ذریعہ یہاں کی اشیاء یورپ اور ایشیا کے بازاروں میں رونق پذیر ہوئیں۔ مختصر یہ کہ سلطنت مغلیہ قوت اور ثروت کے اعتبار سے اس عہد میں اس مقام تک پہنچ گئی تھی کہ ایشیا میں تو اس کی مثال نہیں ملتی اور ہندوستان کی تاریخ میں اس سے پہلے یا اس کے بعد اس کا نمونہ دیکھنے کو نہیں آتا۔ غرض یہ کہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے خوشحال اور آسودہ حال تھی اور ملک روز افزوں ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں ۱۰۶۷ھ میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قید ہوا اور عنان حکومت اس کے بیٹے اورنگ زیب کے ہاتھ میں آئی۔ مغلوں کے درمیان تخت و تاج کے حصول کے لئے برادرانہ خانہ جنگیاں اور کشت و خون ان کی خاندانی روایت اور سنت میں داخل ہے۔ اورنگ زیب کا عہد سیاسی اور ادبی دونوں لحاظ سے متنازع اور نازک ہے۔ شاہجہاں کی مہلک بیماری پر جب اس کے بیٹوں کے درمیان حصول تخت کے لئے جنگ کے شعلے بھڑکے تو اورنگ زیب کے سوا اور سبھی بھائی یعنی دارا، شجاع اور مراد اس شعلے کی نذر ہو گئے اور اورنگ زیب تخت طاؤس کا تنہا وارث اور حکمراں بن گیا۔ اورنگ زیب نے جس وقت سلطنت مغلیہ کی باگ ڈور سنبھالی یہ مملکت اپنی وسعت، طاقت اور اقتدار کے لحاظ سے درجہ کمال پر تھی۔ اس کے عہد حکومت میں تمام ہندوستان سلطنت مغلیہ کا حصہ بن چکا تھا۔ یہ حکومت کشمیر سے کنیا کماری تک اور برما سے غزنی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنی وسیع مملکت کے بہتر انتظام و انصرام کے لئے مملکت کو بیس

صوبوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اور ہر صوبہ کا ایک صوبہ دار مقرر کر دیا تھا۔ اس نے دکن کی تین اور ہمعصر مخالف طاقتوں کا بھی قلع قمع کر دیا۔ یعنی عادل شاہی، قطب شاہی اور مرہٹہ ریاستوں میں سے پہلی دو کو اس نے مکمل طور پر ختم کر دیا اور مرہٹہ طاقتوں کا اس نے پوری طور پر سدباب کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے مملکت مغلیہ کو سب سے زیادہ توسیع بخشی۔ تاریخ کی ابتدا سے انگریزوں کی آمد تک کبھی ہندوستان ایک حکمراں کے زیر نگیں اتنا متحد نہیں ہوا تھا۔ جتنا اورنگ زیب کے ماتحت تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی حکمت عملی اور سیاسی لغزشوں نے مغلیہ سلطنت کی عظیم عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اور اس کی ساری زندگی امید و بیم کی باہم آویزش کا شکار رہی۔ اورنگ زیب کے تقریباً اکاون سال عہد حکومت کا بیشتر حصہ جنگ و خونریزی، لشکر کشی اور ممالک کی تسخیر و فتح کے ہنگاموں میں گذرا۔ اس کی بادشاہت کے ابتدائی اٹھتیس سال قلعوں کی فتح، اور شمال مغربی اور مغربی و مشرقی ہندوستان کے نواح میں بغاوتوں اور شورشوں کے فرو کرنے میں بسر ہوئے۔ زندگی کے باقی ایام اس نے جنوبی ہندوستان کی سرحدوں کو وسعت دینے اور دشمنوں کی سرکوبی میں گذارے۔ ان جنگوں اور فوج کشی کے نتیجہ میں سوائے مالی خساروں اور ملک میں ہر طرف بے اطمینانی اور بدامنی کے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پیہم جنگوں کے سبب شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔ افواج کے مشاہروں اور وظائف کی ادائیگی میں جن کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار ہوتی ہے تعویق ہونے لگی۔[۳] ان پیہم جنگوں اور خونریزیوں کے جو لازمی نتائج برآمد ہو سکتے تھے اس کے آثار تمام ملک میں نظر آنے لگے۔ اس کے علاوہ قدرتی حوادث طاعون اور قحط سالی کی شکل میں ظاہر ہوئے جس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد ہلاک ہو گئے۔[۴] اور کوئی شخص اس خرابی اور بربادی کی تعمیر اور تلافی کے لئے کوشاں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے عہد کے ایک امیر اور فارسی شاعر نعمت خاں عالی نے اپنے قصیدہ میں اس دور کی اس کیفیت کا دردناک خاکہ کھینچا ہے۔ اورنگ زیب کو خود بھی ان تکلیف دہ حالات کا شدت سے احساس تھا وہ جانتا تھا کہ اس کے امراء، فوج کے سپہ سالار، اور سپاہی ان مسلسل جنگوں اور لشکر کشی سے تنگ آچکے ہیں اور اس کی موت کے طلب گار ہیں۔[۵] لیکن ان تمام چیزوں سے قطع نظر جو چیز سب سے زیادہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے لئے مہلک ثابت ہوئی وہ اس کی تنگ نظر حکمت عملی، متشدد ذہنیت اور خشک مذہبیت تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مغلیہ سلطنت کی بنیاد، استحکام اور اس کی توسیع میں ہندوؤں کا زبردست حصہ ہے۔ اکبر و جہانگیر اور کچھ حد تک شاہ جہاں نے بھی ان کی ملکی خدمات اور تعاون کے صلے میں ان کو اپنی سلطنت میں نمایاں مقام دیا تھا۔ لیکن اکبر اور جہانگیر نے اپنے نظام سلطنت اور امور مملکت کی بنیاد جس ہندو مسلم رواداری کے اصول پر قائم کی تھی اورنگ زیب نے اپنے مذہبی تعصبات کے سبب اپنے اسلاف کی اس دیرینہ حکمت عملی سے یک لخت منہ موڑ

لیا۔ مورخین کے خیال میں اورنگ زیب کا زہد خشک اور اس کی غیر رواداری پالیسی اس کی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی۔ اورنگ زیب کے سب سے بڑے ناقد اور مورخ سرجدو ناتھ سرکار کا کچھ ایسا ہی خیال ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اپنی بے مثل شجاعت، بیدار مغزی، دوراندیشی، سپہ گری، آئین حکمرانی میں مہارت اور زبردست سیاسی لیاقت میں شاید سلاطین مغلیہ میں کوئی اس کا حریف نہیں ہے۔ ہم قبل یہ کہہ آئے ہیں کہ تاریخ کی ابتدا سے انگریزوں کی آمد تک ہندوستان کسی ایک حکمراں کے زیر نگیں اتنا متحد نہیں ہوا جتنا اورنگ زیب کے ماتحت تھا۔ پھر اورنگ زیب کی مدت حکومت بھی سبھی سلاطین مغلیہ سے زیادہ رہی۔ اس لئے سلطنت مغلیہ کے زوال کے لئے تنہا اورنگ زیب کی پالیسی کو ذمہ دار ٹھہرانا اصول فطرت اور تاریخ کے خلاف ہے۔ اس عظیم سلطنت کے زوال کی ذمہ داری تنہا اورنگ زیب پر عائد نہیں ہوتی اور ہم اسے اورنگ زیب کی نااہلی اور سیاسی ناکامی کا نام دے کر اپنے منصب سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اورنگ زیب کی ناکامی یہ نہ تھی کہ اس کی سیاسی پالیسی کی بنیاد کمزور نظریات پر رکھی گئی تھی یا اس کی مذہبی سرگرمیاں حکمت عملی کے خلاف تھیں بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اتنی وسیع اور عظیم سلطنت پر حکمرانی کے لئے اسے کوئی لائق وارث نہیں ملا اور درحقیقت یہی سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث ہوا۔

داخلی سیاست سے قطع نظر اس عہد کی خارجی سیاست بڑی استوار تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے دور میں ایران، عرب، حبشہ، ترکی اور مرکزی ایشیا سے بہترین سفارتی تعلقات قائم کئے۔ ان ممالک کے سفراء برابر ہندوستان آتے تھے تاکہ اس عہد کے ہندوستان سے اچھے روابط قائم کر سکیں۔ ان بہترین روابط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ممالک کے شاعروں، ادیبوں، عالموں اور مفکرین کے ذریعہ ان ممالک کی تہذیب ہندوستان پہنچ رہی تھی۔ اور اس عہد کا ہندوستان ان متمدن اقوام کی زبان، مذہب اور تمدن سے بہرہ مند ہو رہا تھا۔

مغلوں کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسی قوم کی تصویر ابھرتی ہے جس کی تہذیب و کلچر میں جلال و جمال اور جس کے تمدن میں رنگ و بو کی علامت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے بہت سارے نقوش مغل تہذیب ہی کے مرہون منت ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے سلاطین مغلیہ نہ صرف صاحب سیف تھے بلکہ وہ صاحب قلم بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علم و فن کی قدردانی کی ایسی مثالیں قائم کیں ہیں جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ علماء اور شعراء کی سرپرستی اور قدردانی اور شاہانہ نوازشوں کے سبب سے اس وقت ہندوستان میں فنون لطیفہ کو بے حد فروغ ہوا۔ یہاں تک کہ ہم عصر ایران کے شعراء اور ادباء نے بھی سرزمین ہندوستان کو اپنی عملی جولان گاہ قرار دیا اور اس ملک سے عالموں اور شاعروں کی جماعت

علم وفن کی داد پانے کے لیے سیلاب کی طرح امڈ کر ہندوستان کی جانب آنے لگی۔ سلاطین مغلیہ اوران
کے دربار کے علم دوست امراء اور حکمراں نے بھی ان کی ایسی عزت افزائی کی اور انہیں ایسے ایسے گراں بہا
انعامات سے نوازا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ مغل سلاطین اپنی نکتہ دانی اور شعر
فہمی میں کسی سے کم نہ تھے۔ اور شعر کی خوبیوں اور خامیوں کی بہترین پرکھ رکھتے تھے۔ یہ شعر و ادب کی محفل
میں محض ایک تماشائی اور سامع کی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ شاعروں کے کلام پر نقد و تنقید، حتیٰ کہ
اصلاح سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ وہ تحسین ناشناس نہیں تھے۔ بے محل نہ ہوگا کہ یہاں اس قول کی شہادت
میں ایک دو واقعہ کا مختصراً ذکر کیا جائے۔ اکبر گرچہ کسی مکتب کا تعلیم یافتہ نہیں تھا اور وہ علم سے بے بہرہ تھا
لیکن اس نے طبیعت شاعرانہ اور فکر ناقدانہ پائی تھی۔ چنانچہ ایک روز اس نے فغانی کا یہ شعر سنا

مسیحا یار و خضرش ہم رکاب و ہم عناں عیسیٰ فغانی آفتاب من بدین اعزاز می آید

فی الفور دوسرے مصرعے پر یہ اصلاح دی

"فغانی شہ سوار من بدین اعزاز می آید"

واقعہ یہ ہے کہ اس ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا۔

جہانگیر ایک زبردست انشاء پرداز تھا اس کے ساتھ ہی اس نے شاعرانہ طبیعت بھی پائی تھی۔
تزک جہانگیری اس کی علمی فضیلت کی شاہد ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر مختلف علوم و
فنون میں بھی صاحب بصیرت تھا۔ اس کے اعلیٰ ذوق شعری کی مثالیں تزک کے صفحات پر نظر آتی ہیں۔

یہاں ایک دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً امیر الامراء کے اس شعر کو سن کر

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

جہانگیر نے اس شعر کے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا۔

از من متاب رخ کہ نیم بی تو یک نفس یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

اسے سن کر اس کی سخن سنج طبیعت اور موزونی طبع کی ہر صاحب ذوق نے داد دی۔ اسی طرح
اس نے ایسے شعراء جو علمی اعتبار سے کم تر اور کم مایہ تھے اور ان کے کلام سے ذم کا پہلو نکلتا تھا ان کی بھی سخت
سرزنش کی چنانچہ کسی شاعر نے جب ایک قصیدہ جہانگیر کی شان میں دربار میں پڑھا تو اس کے مطلع کے
پہلے مصرعہ

ای تاج دولت برسرت از ابتدا تا انتہا

سے ذم کا پہلو پیدا ہوتا تھا۔ جہانگیر کی دقیقہ سنج طبیعت نے اس نقص کو فوراً پہچان لیا اور اس سے سوال کیا

کہ کیا تم علم عروض سے واقف ہو۔ شاعر نے نفی میں جواب دیا۔ جہانگیر بولا کہ اچھا ہوا ورنہ میں تمہاری موت کا حکم دیتا۔ پھر اس مصرعہ کی تقطیع کر کے اس کے رکن دوم میں جو عیب یعنی "لت بر سرت" پیدا ہوتا تھا اس کی نشاندہی کر دی۔ 8 اس طرح یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ایسا ماحول جس کے حکمراں اور پیش رو شعر و ادب کے معاملہ میں اس حد تک دقیقہ رس اور نکتہ سنج ہوں وہ اس میدان میں کتنی پیش رفت کر سکتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس دور کے شعرا و ادبا اپنے فن کی تحقیق میں حد درجہ احتیاط اور دقت نظری سے کام لینے لگے۔ سلاطین مغلیہ کا دربار شعر و شاعری کے لئے ایک مستقل مدرسہ کا حکم رکھتا تھا۔ جہاں ان کے علم و فن کی نہ صرف سرپرستی ہوتی تھی بلکہ ان کی تربیت بھی کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مشاعرے کے رواج نے بھی شعر و شاعری کی ترویج، تشویق اور اس کی ترقی میں بڑی مدد پہنچائی۔ عبدالرحیم خان خاناں اس معاملہ میں دوسروں کے پیش رو سمجھے جاتے ہیں۔ شعر و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہانگیر نے مدرسوں، انشا اور مکاتیب کو رواج دینے میں بھی سعی بلیغ کی اور کئی مدرسے اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ اور ایسے مدرسے جو عرصے سے ویران و غیر آباد تھے ان کی تعمیر نو کر کے ان میں درس و تدریس کا انتظام کیا۔ 9

اکبر اور جہانگیر نے علم و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے اور علمی اور ادبی سرمائے میں جیسے اضافے کئے وہ ہندوستان کے تاریخ ادب کا روشن باب ہے۔ جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا شاہ جہاں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ اگرچہ وہ باپ کی طرح شاعر یا انشا پرداز تو نہ تھا لیکن اسلاف کے علمی کارناموں اور روایت کا سرمایہ اس کے سامنے تھا۔ لہٰذا علم و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے اس نے شایان شان اقدامات کئے۔ اس نے اپنی مملکت میں چند مدرسوں اور دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جس میں سب سے مشہور مدرسہ دارالبقا ہے جو دہلی میں قائم کیا گیا۔ 10 جو اس وقت اسلامی فقہ اور فلسفہ کی تعلیم کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ تمام مسجدوں میں مکاتیب کا انتظام کیا گیا جہاں عام مسلمان بچے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں میں بھی تعلیم و تدریس کا انتظام برا نہیں تھا۔ برہمن علماء ہمیشہ سنسکرت زبان کی درس و تدریس اور مطالعہ میں برابر مشغول رہتے تھے۔ ملک کے اہل کار اور نوکران شاہی زبان فارسی کی تحصیل میں ہمیشہ کوشاں تھے۔ شرفا اور امراء کے بچے اپنے گھروں پر مختلف علوم کے علماء اور اساتذہ سے تحصیل علم کرتے تھے۔

فارسی زبان چونکہ ملک کی سرکاری زبان تھی اس لئے شاہ جہاں کی محبت اور توجہ کا مرکز رہی۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے فارسی زبان کی جبری تعلیم کا حکم نافذ کر دیا تھا۔ اس وجہ سے ہندوستان

کے تمام مدارس میں یہاں تک کہ ہندوؤں میں بھی اس زبان کی تعلیم مروج ہوئی اس کے علاوہ فارسی میں بہترین علمی اور ادبی کتابیں تالیف کی گئیں۔ اس عہد میں ایرانیوں کی آمد اور یہاں کے شعراء، علماء اور ادبا سے ان کا باہم ربط و میل جول اور علمی ارتباط ہندوستان میں دو مختلف دبستان ادب کی تشکیل کا موجب ہوا یعنی ایک دبستان ہندوایران اور ایک دبستان ایرانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں ایرانی اثرات کی کارفرمائی نہیں نظر آتی۔ کیونکہ فارسی زبان جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں پیوست ہو چکی تھیں اس کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ زیادہ عرصہ تک وہ اپنے نئے اور موثر تر ماحول کے اثر سے اپنے کو بے نیاز رکھے اور اس طرح فارسی زبان ہندوستانی عقائد اور افکار کو اپنے میں جذب کرتی رہی اور آہستہ آہستہ ہندوستانی افکار اور موضوعات کے اظہار کا وسیلہ بنتی گئی۔ آخرکار وہ خصوصیات جو ہندوستانی ماحول کے لوازمات میں سے تھے وہ ہندوستانی فارسی ادب کا جزو بن گئے۔ اور اس طرح ایک نیا ہندوایرانی دبستان وجود میں آیا۔ یہ دبستان جو ہمیشہ مغلیہ دربار میں توجہ کا مرکز رہا آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہوتا گیا اور ابوالفضل کی پرتکلف اور مرصع تصنیفیں شاہجہاں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ اسی بنا پر شاہجہاں کو اپنے درباری وقائع نویسی کے لئے ایک ایسے ادیب کی تلاش ہوئی جو اس عہد کے واقعات کو اسی پرتکلف، مرصع اور مسجع عبارت میں قلم بند کرے۔ ہندوستان کے مغلیہ سلاطین کے دربار میں اس ہندوایرانی دبستان کی ترویج اور ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ درباری وقائع نویس یا ادیب اپنی پرشکوہ، پرتکلف اور دقیق عربی آمیز الفاظ اور عبارات کے ذریعہ بادشاہ وقت کے جاہ و جلال، شان و شوکت اور اس کے رعب و دبدبہ کو بہتر طور پر قاری کے ذہن میں منعکس کر سکے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ مرصع اسلوب اپنی پرشکوہ اور پرتکلف عبارت آرائی کے ساتھ برابر مغلیہ دربار میں پھلتا پھولتا رہا۔

دوسرا دبستان جسے ہم دبستان ایرانی کا نام دیتے ہیں وہ ایرانی نژاد وزراء اور امراء کی توجہ کا مرکز رہا۔ شاہجہاں کے عہد میں ملا شکراللہ جو افضل خاں کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، انہوں نے ایرانی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی اور برابر ان کی عزت افزائی اور نوازشوں میں مشغول رہے۔ جس میں محمد امین قزوینی اور جلال الدین طباطبائی بہت مشہور ہیں۔ جب ان دو مختلف دبستانوں کے شعرا اور ادبا کی تصانیف کا باہم مقابلہ کرتے ہیں تو وہ فن پارے جو ایرانی نژاد فنکاروں کے ہیں وہ اپنے معاصر ہندی نژاد فنکاروں کی تصانیف سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

اکبر اور جہانگیر کے عہد کی طرح شاہجہاں کے عہد میں بھی شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں ایران سے آتی رہی کیونکہ ایران میں مذہبی مجتہدین اور فقہا کے اثر و نفوذ

سے انہیں اپنے علم وفن کی نمائش کے بہت مواقع میسر نہیں تھے۔ اور وہاں کا ماحول ان کے لیے سازگار نہ تھا۔ جیسا کہ اس عہد کا ایک مشہور شاعر علی قلی سلیم تہرانی کہتا ہے۔

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال   تا نیامد سوئے ہندوستان حنا رنگیں نہ شد

اس عہد کے شاعروں کی تعداد کثیر ہے جن میں مشہور صائب، قدسی، کلیم، مرزا طاہر آشنا، حکیم رکنا کاشی، سعیدائے گیلانی، سلیم تہرانی، میر الٰہی ہمدانی اور محمد علی ماہر وغیرہ ہیں۔ شعراء کے علاوہ نثر نگاروں کی فہرست بھی طویل ہے جن میں مشہور منیر لاہوری، جعفری مشہدی، ملا شیدا، چندر بھان اور افضل خاں وغیرہ ہیں۔ تاریخ نویسی کے فن میں بادشاہ نامہ کے مصنف عبدالحمید لاہوری، تاریخ صادق کے مولف ملا صادق اور عمل صالح کے مولف محمد صالح کنبوہ کا نام سرفہرست ہے۔ اس عہد میں فرہنگ نویسی کو بھی کافی فروغ ہوا۔ اس دور کی فرہنگوں میں فرہنگ رشیدی، منتخب اللغات، شاہد صادق اور چہار عنصر دانش خاصی شہرت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ فلسفہ، مذہب، طب، نجوم اور دوسرے علوم وفنون میں بھی کثرت سے کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔ مختصر یہ کہ شاہجہاں کا دربار فارسی زبان وادب کے لئے ایک مخزن کی حیثیت رکھتا ہے اور دور شاہجہانی اپنے تہذیب وتمدن اور ادب وفن کی ترقی کے اعتبار سے مغلیہ ہندوستان کا دور زریں کہا جا سکتا ہے۔ جس وقت ایران میں صفوی بادشاہوں کے دربار میں فارسی زبان پر ترکی زبان غالب آگئی ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کے دربار میں فارسی زبان دفتری زبان کے منصب پر فائز ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تمام مکاتیب، فرامین اور اسناد فارسی زبان میں لکھے جانے لگے اس کے علاوہ دربار کے امرا اور روسا جیسے آصف خاں، ظفر خاں احسن، مہابت خاں، افضل خاں، راجا جے سنگھ اور سعد اللہ خاں جو فارسی زبان اور علم وادب سے گہری محبت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی شاہ جہاں کے حکم کی پیروی کی اور شاعروں اور عالموں کی سرپرستی اور علم وفن کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا بلکہ اس میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کا عہد حکومت تراجم کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا۔ شاہجہاں کے لڑکے دارا شکوہ نے اس میدان میں سب سے زیادہ اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے سنسکرت کی مقدس کتابیں مثلاً اپنشد، بھگوت گیتا، یوگا وششت اور ہندوؤں کی دوسری مذہبی اصطلاحات کو فارسی زبان کا جامہ پہنایا۔ اس کے علاوہ مشہور ہندوستانی رزمیہ کا ترجمہ بھی کرن کی مدد سے بڑی عرق ریزی کے ساتھ کیا۔[12]

اب تک کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا پودا

بادشاہوں اور امرائے وقت کی سرپرستی اور شاہانہ نوازش کی آبیاری سے سیراب ہوتا رہا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی علمی قدردانیوں اور الطاف و اکرام نے ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک کے شاعروں، ادیبوں اور دیگر ارباب علم و فن کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور وہ کشاں کشاں ہندوستان کی طرف آنے لگے۔ جس سے ہندوستان کی فارسی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ دیگر فنون لطیفہ کو بھی بے حد فروغ ہوا۔ بادشاہ کا ہر صلہ و انعام شعر و ادب کی ترقی کا موجب بنتا گیا۔ کبھی ایک خوبصورت اور نادر شعر کے لیے شاعر کا منہ زر و جواہر سے بھرا گیا اور کبھی اس کو سونے اور چاندی سے وزن کیا گیا۔ شاہان ہند کی یہی دریا دلی اور علم دوستی تھی کہ ایران اور دوسرے ممالک سے شعرا کی ان گنت تعداد یہاں آئی اور بہتیرے ہندوستان آنے کی تمنا میں رخصت ہوگئے۔ اس عہد کے ایرانی شعراء کے دواوین اس قول کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو یہ شاہانہ سرپرستی اور ترغیب و تشویق کا سلسلہ بتدریج کم ہوتا گیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکبر و جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں جس طرح ایران کی سرزمین شاعروں اور فنکاروں کے اظہار فن کے لیے سازگار نہ تھی اور سلاطین صفویہ کا زہد خشک ان کی ادبی سرگرمیوں کے لیے مانع تھا وہی صورت حال اورنگ زیب کے عہد کے ہندوستان میں رونما ہو رہی تھی۔ چنانچہ عہد ماقبل میں شعراء و علمائے ایران کا ہندوستان کی جانب ہجرت کا جو سبب ہوا وہ اورنگ زیب کے عہد میں ان کے ہندوستان نہ آنے کا سبب بن گیا۔ چنانچہ اس عہد میں جو شعرا ایران سے ہندوستان آئے ان کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً محمد سعید اشرف مازندرانی، مرزا معز الدین موسوی خاں فطرت، سید حسین خالص اصفہانی، اور مرزا محمد طاہر اصفہانی وغیرہ۔

اورنگ زیب عالمگیر ایک زبردست عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ کتابوں کے مطالعہ کا اسے بے حد شوق تھا۔ وہ مذہبی علوم مثلاً فقہ، حدیث اور تفسیر کا ماہر تھا اور جہانگیر کی طرح ایک زبردست انشاء پرداز تھا۔ اس کے مکاتیب کا مجموعہ رقعات عالمگیری کے نام سے مشہور ہے جو اپنی ادبیت اور اسلوب کے اعتبار سے ہندوستان کے فارسی ادب میں اعلیٰ مقام کا حامل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد بلگرامی نے ان رقعات کی زبان و سہل ممتنع کی بہترین مثال قرار دیا ہے۔[3] چونکہ اورنگ زیب شریعت کا بے حد پابند تھا اور دینی امور سے اسے بے حد شغف تھا اس لئے ایسے اشعار کہ جن کی بنیاد مبالغہ بے جا مدح اور چاپلوسی پر تھی اس کی غیور طبیعت کو گوارا نہ تھے اور بعض سلاطین صفویہ جیسے شاہ طہماسپ کی طرح وہ نہیں چاہتا تھا کہ شعرا اس کی بے جا تعریف و توصیف سے اپنی زبان کو آلودہ کریں۔[4] اس طرح وہ شعرا جنہوں نے شاعری کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا اس کے دربار میں رسائی حاصل نہ کر سکے اور وہ ان کو بیکاروں کی صف میں گردانتے ہوئے

کسی ترغیب کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا۔ شاعروں کی جانب سے یہ سرد مہری اس بات کا سبب ہوئی کہ اکبر و جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں شاعروں کا جو سیلاب ایران سے ہندوستان کی جانب چلا تھا یکایک رک گیا۔ لیکن فارسی شعر و ادب کا وہ ذوق و شوق جو سالہا سال سے اس سرزمین کے لوگوں میں سرایت کر چکا تھا اور اس کی شیرینی اور لطافت سے جو لوگ آشنا ہو چکے تھے وہ اس سے کنارہ کش نہ ہو سکے۔ ہاں! یہ ضرور تھا کہ شاہانہ سرپرستی سے یہ دور عاری تھا اور درباری شاعری بالخصوص قصیدہ کے لئے یہ دور مطلق سازگار نہ تھا۔ لیکن اس سے شعر و شاعری کو ایک حد تک بڑا فائدہ ہو یعنی شاعری ایک تنگ، محدود، طمع اور چاپلوسی کے ماحول سے باہر نکل آئی اور کھلی فضا میں سانس لینے لگی۔ اب وہ عوامل جو ان کے آثار و افکار کی تخلیق و تحریک کا باعث ہوتے تھے اس کی اہمیت جاتی رہی اور اس کی جگہ دوسرے عوامل نے لے لی۔ یعنی اس کے قبل شعرا بادشاہ، امرا اور مربیوں کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی جا و بے جا توصیف کو ہی اپنی شاعری کا موضوع بناتے تھے اور انہیں جذبات سے ان کی شاعری کو تحریک ملتی تھی۔ اب اجتماعی و اخلاقی اور دوسرے مسائل زندگی ان کی توجہ کا مرکز بن گئے اور انہیں مسائل کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا۔ اس طرح شعر و شاعری کے اسلوب اور انداز بیان میں تغیر رونما ہوا۔ شاعری جو اب تک بادشاہوں، امیروں اور رؤسا کی محفلوں کی رونق تھی اب وہ عوام الناس کے گھروں میں بار پانے لگی۔ اس طرح شاعری کا کینوس (canvas) پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گیا۔

جیسا کہ ہم قبل کہہ چکے ہیں کہ فارسی زبان جو مغلوں کے ساتھ اس سرزمین میں داخل ہوئی دھیرے دھیرے سرکاری زبان کے درجے کو پہنچی اور اس عہد میں وہ علم و فضیلت کا معیار قرار پائی۔ یہاں تک کہ عہد اورنگ زیب اور اس کے مابعد عہد میں فارسی زبان ہی تنہا لوگوں کے احساسات و جذبات اور عقائد و افکار کے اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ یہ اپنے اصلی رنگ اور روش کو چھوڑ کر جدید ماحول اور فضا سے اثر قبول کرنے لگی۔ زبان و ادب کی تاریخ میں یہ رد و قبول اور تغیر و تبدل عین اصول فطرت ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی احیا کے باوجود اس عہد کے فارسی ادب میں ہندو معاشرت اور ہندو احساسات کی عکاسی نسبتاً زیادہ ہے۔ اس دور میں بھی کئی بلند پایہ اور خوش فکر شعراء موجود تھے مثلاً مرزا عبدالقادر بیدلؔ، ناصر علی سرہندی، معزالدین موسوی خان فطرتؔ، محمد علی ماہر، سعید اشرفؔ گیلانی، نعمت خان عالیؔ، محمد زماں خان راسخؔ، رفیع خاں باذلؔ، غنیمت کنجاہی، محمد افضل سرخوش وغیرہ جن کی قادر الکلامی اور کمال فن کی مثالوں سے اس عہد کی تاریخیں اور تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

اس دور کا نثری سرمایہ مقدار اور معیار کے اعتبار سے گذشتہ دور کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔

اورنگ زیب نے اصول دین کے فروغ پر تمام چیزوں سے زیادہ توجہ دی۔ اسی مناسبت سے اس نے اس عہد کے بزرگ علمائے حنفی کی نگرانی میں حنفی فقہ اور اصول کی تدوین و تالیف کا کام سرانجام دیا اور فتاوائے عالمگیری کے نام سے یہ کتاب مرتب کرائی جو اس دور کا ایک زبردست علمی اور دینی کارنامہ ہے۔ یہ عہد مکتوب نگاری اور انشاء پردازی کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے۔ فارسی مکتوب نگاری میں اورنگ زیب خود ایک بلند پایہ مقام کا حامل ہے۔ اس نے اس فن کی ایک صحت مند روایت قائم کی جس کی تقلید اس کے ہم عصر ادیبوں نے کی، یہ خطوط سادہ بھی ہیں اور مرصع بھی لیکن آخری طرز ہی زیادہ مقبول خواص رہا۔ چنانچہ بیدلؔ، نعمت خاں عالی، خلیفہ شاہ محمد اور میر عبدالجلیل بلگرامی مرصع نگاری کے اماموں میں گنے جاتے تھے۔ اس فن پر متعدد کتابیں بھی تصنیف کی گئی۔ مکاتیب اور انشاء کے علاوہ اس دور میں تصوف اور اخلاق کے موضوع پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ اس میدان میں عاقل خاں رازیؔ اور ارادت خاں واضح جیسے امرائے عہد نے تصوف پر جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان سے اس دور کی سماجی اور اخلاقی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ عالمگیر نامہ کے مصنف محمد کاظم، مآثر عالمگیری کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں، وقائع کے مولف نعمت خاں عالیؔ اور مراۃ العالم کے مولف بختاور خاں اور ہندو مورخوں میں ایسرداس اور سجان رائے بھنداری جو خلاصۃ الترتیب فتوحات عالمگیری اور خلاصۃ التواریخ کے مولف ہیں، کا نام اس عہد کے مشہور مورخین اور نثر نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ اس دور کے نثر نگاروں اور شاعروں میں ہندوستانی موضوع اور علوم سے خاص دلچسپی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی کی کہانیاں فارسی میں لکھی گئیں۔ عشقیہ داستانوں میں مادھوداس گجراتی نے میکا دمنوہر کا قصہ لکھا۔ ہمت خاں نے کامروپ و کام لتا کے ہندوستانی قصہ کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ چندرمن بیدل نے نظم اور نثر دونوں میں رامائن لکھی۔ بینشیؔ اور موسوی خاں فطرت نے قصہ بنارس کو نظم کا جامہ پہنایا۔ ہندو مذہب پر ایک اہم کتاب منوشاستر کا فارسی میں لال بہاری سکسینہ نے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ مذہب، صرف و نحو، لغت اور دیگر علوم و فنون پر بھی اس عہد میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن کی ادبی قدر و قیمت بھی کسی طرح کم نہیں۔ طوالت کے خوف سے ان کا ذکر یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ A Cambridge History of India vol IV P 119 120

۲۔ A Cambridge History of India vol IV P 218

۳۔ A short History of Aurangzeb, J N Sarkar, Calcutta 1954, P 420

۴۔ A short History of Aurangzeb, J N Sarkar, Calcutta 1954, P.421,422

۵۔ A short History of Aurangzeb, J N Sarkar, Calcutta 1954, P.425

۶۔ بزم تیموریہ، مطبوعہ ص ۹۱

۷۔ تزک جہانگیری، ص ۱۱۴

۸۔ بزم تیموریہ، مطبوعہ ص ۱۴۱

۹۔ بزم تیموریہ، مطبوعہ ص ۱۶۸

۱۰۔ آثار الصنادید، باب سوم، ص ۱۴

۱۱۔ History of Shahejahan of Delhi, P 257

۱۲۔ سخندان فارس، ص ۱۹۳

۱۳۔ تاریخ عالم آرائے عباسی۔ جلد اول، ص ۱۲۹

ڈاکٹر آفتاب اشرف
شعبہ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج،
دربھنگہ

بہادر شاہ ظفر: اولین مجاہد آزادی ہند

سلطنت مغلیہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کا شمار ہندوستان کے اول آزادی خواہ اور قومی یکجہتی کے حامی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۷۷۵ء میں دلی کے لال قلعہ کے اندر لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ دوسرے مغلیہ شہزادوں کی طرح ان کی بھی تعلیم و تربیت کی گئی اور انہیں عصری تقاضوں کی روشنی میں مروجہ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا گیا۔ خصوصاً عربی، فارسی اور سیاسیات میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ظفر اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، منشی احمد حسین، منشی کریم الدین، مولوی امام بخش صہبائی، عبد الغفور ساخ، خواجہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد جیسے عظیم تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے اپنے عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ظفر بیک وقت فارسی اور اردو دونوں زبان کے عظیم شاعر تھے۔ دونوں زبان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

اردو

شعلہ ہے وہی شمع وہی ماہ وہی ہے | خورشید وہی نور سحر گاہ وہی ہے
حور و ملک و دیو پری انس و جن جان | سب صورتوں میں ماہ دلخواہ وہی ہے

فارسی

ایں کہ بینی ہمہ با تاب و جان ہمہ اوست | بلکہ ہم تاب و ہم روح روان ہمہ اوست
آنچہ بیرون و درون ست عیان ست عیان | راز فاش ہمہ او و نہان ہمہ اوست

شہسواری، تیر اندازی اور تلوار زنی میں ظفر بے مثال تھے۔ اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد آپ ستمبر ۱۸۳۷ء میں مالک تخت و تاج ہوئے۔ یہ بات ان دنوں کی ہے جب انگریز ہندوستان میں پوری طرح پھیل چکے تھے۔ اور اپنی تجارت کی ترویج و ترقی کے ساتھ ہندوستانی حکمرانوں کی حکمرانی میں عملی شرکت کے لئے کوشاں تھے۔ مغلیہ روایت کے مطابق شہنشاہ کے یوم پیدائش پر گورنر جنرل اور

کمانڈر انچیف کی جانب سے تحفے پیش کیے جاتے تھے، لیکن انگریزوں نے نہ صرف ان روایتوں کو توڑا، بلکہ شہنشاہ کو (His Excellency) کی جگہ (Dear) لکھنے لگے۔ بہادر شاہ ظفر کو بچپن سے ہی انگریزوں سے چڑھ تھی۔ وہ انہیں غیر ملکی سمجھتے تھے اور ملک سے انہیں نکالنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہنشاہ کی بے عزتی پورے ملک کی بے عزتی ہے۔

انگریزوں کی عیاری اور چالاکی ظفر پر پوری طرح واضح تھی۔ شہنشاہ کو بے عزت کرنے کے لئے انگریز طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ جب ظفر شہنشاہ ہند ہوئے تو اس وقت بھی East India Company نے ان کی پنشن بڑھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن بعد میں پھر انکار کر دیا اور ظفر پر دباؤ ڈالا کہ انہوں نے کمپنی پر جو دعوے کیے ہیں وہ سب غلط ہیں لہٰذا اسے واپس لیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ East India Company کو بہادر شاہ ظفر سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں گورنر جنرل نے ایک ایسا حکم جاری کیا تھا جو آگے چل کر انگریزوں کے لیے مصیبت بن گیا۔ حکم یہ تھا:

''جب دہلی کے بادشاہ کی موت ہو جائے تو اس کا جانشین بنانے کے سلسلے میں ہر معاملے میں گورنر جنرل کی رضامندی ضروری ہوگی۔''

جہاں تک جانشینی کا سوال تھا، اس میں کسی بھی طرح کی رکاوٹ شہنشاہ کے دائرۂ اختیار میں شمولیت کا درجہ رکھتی تھی جس کا ثبوت ۱۸۳۹ء میں مل بھی گیا تھا۔ ہوا یہ کہ شہزادہ دارا بخت کے انتقال کے بعد بہادر شاہ بیگم زینت محل کے بیٹے شہزادہ جواں بخت کو جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے ظفر کے دوسرے بیٹے مرزا فخرو کو ورغلا کر اس سے انکار نامہ لکھوالیا کہ اگر اسے جانشین مقرر کیا گیا تو وہ لال قلعہ چھوڑ دے گا اور وہاں چلا جائے گا جہاں انگریز چاہیں گے۔ ظفر نے اس پر اعتراض بھی کیا لیکن انگریز نہ مانے اور وہی کیا جو چاہتے تھے۔ دراصل یہی وہ واقعہ ہے جس کی وجہ سے ظفر کے سینے میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ شعلہ زن نظر آتی ہے۔ لیکن کرشمہ قدرت دیکھئے کہ ۱۸۵۴ء میں میرزا فخرو کی موت واقع ہو گئی اور ایک بار پھر جانشینی کا مسئلہ پیش آیا۔ ظفر نے پھر شہزادہ جواں بخت کو ہی اس لائق سمجھا، اور ظفر کے آٹھ دوسرے شہزادے بھی اپنے باپ کی مرضی پر راضی ہو گئے۔ لیکن انگریز بھلا کہاں چین سے بیٹھنے والے تھے، انہوں نے پھر ظفر کے لڑکوں میں سے ایک کو ورغلایا اور اس سے من چاہی تحریر لکھوائی۔ ان واقعوں کی وجہ سے دلی والوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ اور شعلہ زن ہو گئی وہ ادھر گورنر جنرل نے ریزیڈنٹ کو ایک ایسا خط لکھا جو ایک تو اپنے آپ میں نہایت گھٹیا تھا اور دوسری جانب انگریزوں کی ذلیل حرکتوں پر دال تھا۔ اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ فرمایئے

"شہنشاہ کی ظاہری آب و تاب اور قدرتی آراستگی اتر چکی ہے۔ اب نہ اس کے جاہ و جلال میں وہ چمک ہے اور نہ شہنشاہ کے وہ اختیارات ہیں جس پر آلِ تیمور کو گھمنڈ تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے بعد ایک معمولی نوکِ قلم کے سہارے بادشاہت ختم کر دی جائے گی۔"

بہادر شاہ ظفر کو جو کچھ پہلے کمپنی کی جانب سے نذرانہ کے طور پر ملتا تھا، وہ پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ اب کمپنی کی جانب سے جو سکہ شہنشاہ کے نام سے ڈھالا جاتا تھا، وہ بھی بند کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کی مہر میں جو پہلے بادشاہ کا خاص نوکر لکھا جاتا تھا، اسے بھی ہٹا دیا گیا اور ہندوستان کے رئیسوں، امراء کو کہا گیا کہ وہ بھی بادشاہ کے سلسلے میں ایسے ہی نا ملائم الفاظ کا استعمال کریں۔ ان تمام باتوں کے پس منظر میں انگریزی سرکار نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب دکھاوے کی کوئی بھی ایسی بات باقی نہ رکھی جائے جس سے ہماری حکومت شہنشاہ کے قبضے میں معلوم ہو۔ جہاں تک شہنشاہ کے خطاب کا سوال ہے تو وہ اب ہماری سرکار کی مرضی پر ہے کہ خطاب دیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

گورنر جنرل کی مذکورہ تحریر سے عیاں ہے کہ انگریز ہر قیمت پر شہنشاہ ہند کو ذلیل کرنا چاہتے تھے اور پوری حکومت اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام ہندوستان پر ہماری حکومت ہو اور ہندوستانی عوام ہمارا غلام بن کر رہے۔ بادشاہ کے خلاف انگریزوں کی یہ سازش دلی کے ہندو اور مسلمانوں دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بہادر شاہ اور بیگم زینت محل کے حکم سے جو ذمہ داریاں نبھائیں، وہ ہندوستان کی تاریخ میں قومی یکجہتی کی ایک لازوال مثال ہے۔ ظفر کے اندر اب تاب ضبط نہ تھی۔ وہ ہر لحہ اس فکر میں رہنے لگے کہ کس طرح ہندوستان سے انگریزوں کو باہر نکالا جائے۔ اپنی اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے ملک کے ان تمام راجاؤں، نوابوں اور دوسرے سربرآوردہ لوگوں سے اپنا تعلق استوار کیا جو ان کے اس منصوبے میں ان کی مدد کر سکتے تھے۔

ادھر جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، بہار کیسری بابو، کنور سنگھ، نانا صاحب پیشوا، ہریانہ، راجستھان اور مہاراشٹر وغیرہ کے حکمرانوں کے دلوں میں بھی انگریزوں کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ سب کے سب ملک کو آزاد کرانے کے لئے کوشاں تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ، بیگم حضرت محل، بخت خاں، غلام غوث خاں وغیرہ بھی پوری تیاری کر چکے تھے۔ ظفر تمام ملک کے لوگوں سے مراسلہ کے ذریعے یہ طے کر چکے تھے کہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ کو سارے ملک کی عوام، راجا، مہاراجا اور آزادی کے متوالے ایک ساتھ انگریزوں پر حملہ کریں گے اور انہیں ہندوستان سے نکال دیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ منصوبہ بہت

رازدارانہ طور پر مرتب کیا گیا تھا، کمل کا پھول اور چپاتی انقلاب کے نشان معین کیے گئے تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ منصوبہ اپنے آپ میں بہت کامیاب تھا، اگر اسی کے مطابق عمل درآمد ہوتا تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور انگریز ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستان چھوڑ کر چلے جاتے۔

لیکن ایک بہادر سپاہی منگل پانڈے کا جذبہ حمیت اتنے دنوں تک اسے برداشت کرنے پر راضی نہ تھا وجہ یہ ہے کہ جب اسے معلوم ہوا کہ سپاہی جو کارتوس استعمال کرتے ہیں، وہ اسے اپنے منہ سے کھولتے ہیں، اسے انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کو ناپاک کرنے کی غرض سے سور اور گائے کی چربی ملادی ہے، تو اس بہادر سپاہی نے غصہ کے عالم میں انگریز افسروں کو مارنا شروع کردیا۔ آخر کار انگریزوں نے اس بہادر سپاہی کو تختہ دار پر چڑھادیا۔ پھر کیا تھا ادھر منگل پانڈے کا پھانسی پر لٹکنا تھا کہ ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کی فوجی چھاؤنیوں پر دھاوا بول دیا اور انگریزوں کو چن چن کر مار ڈالا۔ آخر کار ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے انقلابیوں کا ایک عظیم گروہ دلی پہنچا۔ اور ظفر کو ۲۱ توپوں کی سلامی پیش کی اور لال قلعہ پر ہرا اور سنہرا جھنڈا لہرا کر بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ ہند کا خطاب دیا۔ یہ عوام کی لڑائی تھی۔ بہادر شاہ کے پرچم تلے ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان جمع ہوگئے۔ قومی یکجہتی کی اس سے بڑی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ظفر نے اپنے بیٹے میرزا مغل کی جگہ بخت کو بٹھایا اور فرمایا ''بہادر مجھے تم پر بڑا بھروسہ ہے۔'' اسی موقع پر ظفر نے ہندوستانی عوام کو یک پیغام میں کہا تھا۔

''میری یہ دلی خواہش ہے کہ جس قیمت پر اور جس ذریعہ سے بھی ہو سکے فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا جائے۔ میری یہ زبردست خواہش ہے کہ تمام ہندوستان آزاد ہو جائے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو جنگ شروع کی گئی ہے وہ اس وقت تک فتح یاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ کوئی ایسا آدمی جو اس تحریک کے تمام بار کو اپنے کندھے پر نہ اٹھالے اور خود کو تمام قوم کا نمائندہ کہہ سکے اور میدان میں آکر اس انقلابی جنگ کی قیادت اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔

انگریزوں کو ملک سے نکال دیئے جانے کے بعد اپنے ذاتی فائدے کے لئے ہندوستان پر حکومت کرنے کی بخدا میری ذرا بھی خواہش نہیں ہے۔ یاد رکھیں خدا نے انسان کو جتنی بھی قیمتی نعمتیں عطا کی ہیں، ان میں سب سے بڑی برکت آزادی ہے۔ اس لئے ہمیں ہر قیمت پر اپنی آزادی کی حفاظت کرنی ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ سے یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ملک سے انگریزوں کو نکال دیئے جانے کے بعد میں اپنے تمام شاہی اختیارات قوم کے اس شخص کے ہاتھوں سونپ دوں گا جسے آپ لوگ

چھین گے۔ آپ سب لوگ یہ بھی اچھی طرح سن لیں کہ اب کی اس فوج میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہٹا دی گئی ہے اور ہر فوجی کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جائے گا۔ اور آزادی کی اس پاک جنگ میں جتنے لوگ تلوار چلائیں گے وہ سب ایک طرح کے انعام کے حقدار ہوں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر جمہوریت اور آزادی کے سب سے بڑے حامی اور قائل تھے۔ ان کے مذکورہ پیغام کا عوام کے دلوں میں یہ نقش بیٹھ گیا کہ بہادر شاہ کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار تھے۔ ظفر نے ہندوستانی عوام کے نام احکام کی شکل میں پیغام جاری کرتے ہوئے دوبارہ فرمایا

"کچھ ہندو اور مسلمان سرداروں نے جنہوں نے اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے اپنے گھروں کو ترک کر دیا ہے اور جو ہندوستان سے انگریزوں کو ہٹا نکالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں، مابدولت کے پاس آئے ہیں اور موجودہ جنگ آزادی میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس بات کا بہت امکان ہے کہ مستقبل قریب میں مابدولت کو مغرب کی جانب سے فوجی کمک ملے گی اس لیے یہ خاص و عام کے لیے یہ اشتہار جاری کیا جاتا ہے۔ ہر آدمی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اشتہار کی حفاظت کرے اور اس میں مندرج باتوں پر عمل کرے۔ معاشی اعتبار سے کمزور لوگ اس جنگ میں شامل ہوں مابدولت کی جانب سے انہیں معاوضہ ملے گا۔"

دوسری جگہ انہوں نے پھر فرمایا:

"ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قدیم تحریریں، نجومیوں اور پنڈتوں کے حساب و کتاب وغیرہ وغیرہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ انگریزوں کی حکومت ہندوستان یا کسی دوسرے ملک میں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہے گی۔ اس لیے ہر آدمی پر لازم ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے قائم رہنے کی امید کو دلوں سے نکال دیں اور مابدولت کا ساتھ دیں۔ اور اجتماعی محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی انفرادی کوششوں کے طور پر ملوکیت کو قائم کرنے میں مدد دیں اور اس طرح اپنے مقاصد کو پورا کریں۔ نہیں تو اگر یہ سنہرا موقع ہاتھ سے نکل گیا تو ان کو اپنی غلطی پر ہاتھ ملنا پڑے گا۔"

ایک دوسرے موقع پر انہوں نے عوام کو یہ بھی پیغام دیا تھا

"کسی آدمی کو بھی انگریز حکومت کی دوغلی پالیسی کی وجہ کر ان پریشانیوں سے جو عام طور پر انقلاب کا حصہ ہیں، یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ملوکیت کے قیام کے بعد پریشانیاں برقرار رہیں گی اور ایسے لوگوں کو جن کے ساتھ کسی سپاہی یا لوٹ مار کرنے والوں نے برا سلوک کیا ہو۔ مابدولت کے حضور میں

شکایتیں پیش کرنی چاہئیں۔ ملوکیت کے مکمل قیام کے بعد شاہی خزانے سے ان کی بربادی پوری کی جائے گی۔ جو موجودہ افراتفری میں ہوئی ہے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ بہادر شاہ ظفر سے عوام بے حد خوش تھے اور انہیں انتہائی درجہ چاہتے تھے۔ وہ صوفی منش اور بلند کردار انسان تھے۔ وہ بہ ذات خود عوام سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات بھی کرتے تھے۔ انہی وجوہات کی بنا پر ان کے پیغامات کا عوام کے دلوں پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں ظفر نے بڑی دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک موقع پر ان کا ایک دوسرا پیغام جو بذات خود نہایت اہم اور مفید تھا یہ ہے

"اے ہندوستان کے فرزندو! اگر ہم ارادہ کرلیں تو بات کی بات میں دشمن کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور اپنے مذہب اور اپنے ملک کو جو ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، خطروں سے بچا سکتے ہیں۔"

متذکرہ بالا تمام اعلانات کا عوام کے دل و دماغ پر ایسا اثر مرتسم ہوا کہ لوگ بے خطر جنگ آزادی کے میدان میں کود پڑے، اس نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دئے، دلی کے تمام انگریزوں کو مار ڈالے اتفاق سے جو بچ گئے وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے۔ پوری دلی آزاد ہوگئی اس کی خبر انگلینڈ تک پہنچی۔ انگریزوں کو یہ گمان ہوگیا کہ اب ان کا پاؤں دلی میں نہ جم سکے گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ یہاں تک سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اب ہندوستان چھوڑ دینے میں ہی بھلائی ہے۔ ادھر دلی آزاد ہوگئی، سارے شہر میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ بوڑھے بادشاہ کی رگوں میں دوڑتا ہوا مغلیہ خون پورے ملک کو آزاد کرانے کے لئے تیز تر ہوگیا۔ اس موقع پر بہادر شاہ ظفر نے بہادر عوام اور سپاہیوں کی ہمت افزائی اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے سلسلے میں ایک نہایت پرجوش تقریر کی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"ہندوستان کے ہندوؤ! اور مسلمانو! اٹھو! بھائیو! اٹھو! خدا نے جتنی برکتیں انسان کو عطا کی ہیں ان میں سب سے قیمتی برکت آزادی ہے۔ کیا یہ ظالم طاقت جس نے دھوکا دے کر یہ برکت ہم سے چھین لی ہے، ہمیشہ کے لئے ہمیں اس سے محروم رکھ سکے گی؟ کیا خدا کی مرضی کے خلاف اس طرح کا کام ہمیشہ جاری رہ سکے گا؟ نہیں نہیں — فرنگیوں نے اتنے ظلم کئے ہیں، ان کے گناہوں کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہمارے پاک مذہب کو گندہ کرنے کی ناپاک کوشش ان میں پیدا ہوگئی ہے۔ کیا اب بھی خاموش بیٹھے رہوگے؟ خدا اب یہ نہیں چاہتا کہ تم خاموش رہو۔ کیوں کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کی خواہش پیدا کردی ہے اور خدا کے فضل سے اور تم لوگوں کی بہادری کی برکت سے جلد ہی انگریزوں کو اتنی کامل شکست ہوگی کہ ہمارے اس ملک ہندوستان سے ان

کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ ہماری اس فوج میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز مٹا دی جائے گی اور سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا۔ آپ سب بھائی بھائی ہیں۔ ان میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ اس لیے میں پھر اپنے ہندوستانی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ اٹھو اور خدا کے بتائے اپنے اولین فرض کو پورا کرنے کے لئے میدان جنگ میں کود پڑو۔"

دلی پوری طرح آزاد ہو چکی تھی، اب پورے ملک کی آزادی کی بات سوچی جا رہی تھی اور تقریروں نے آگ میں گھی کا کام کیا ہر جگہ بغاوت کا لاوا پھوٹنے لگا۔ انگریز تذبذب کے عالم میں تھے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہئے۔ عین اسی وقت انگریزوں کو اعلیٰ کمان سے حکم ملا کہ اس وقت ہندوستان پر حکومت کرنے کا سودا سر سے نکال دو اور جس قیمت پر ہو وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دو۔ اور ظفر نے جو یکجہتی قائم کی ہے اسے آپسی نفاق میں تبدیل کردو۔ چنانچہ یہی ہوا اور ہندوستانی عوام پھر انگریزوں کے دام فریب میں پھنس گئے۔ ہندو مسلمان تو کُجا، انگریزوں کی عیاری اور چالاکی سے بھائی سے بھائی لڑ بیٹھے۔ نواب الٰہی بخش نے شہنشاہ ہند بننے کے لیے میر جعفر، پنجابی اور گورکھا فوجوں کی مدد سے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرا دیا۔ چنانچہ دلی ایک بار پھر غلام ہو گئی۔ دلی واپس پر انگریزوں نے نہایت اذیت ناک ظلم ڈھائے اور دلی کو خوب لوٹا۔ ظفر کو اپنی گرفتاری کا غم نہ تھا، اسے غم تھا تو صرف اس بات کا کہ جو لوگ میرے آباواجداد کے رحم وکرم پر ہندوستان میں بسے تھے، آج وہ یہاں حکمران ہو گئے ہیں اور حکمران مجرم۔ انگریزوں نے ظفر پر بہت ظلم ڈھائے۔ انہوں نے کئی شام کے بھوکے ظفر کے سامنے ان کے جوان بیٹے اور پوتے کا سر کاٹ کر پیش کیا اور طنزاً یہ کہا کہ یہ کمپنی کی جانب سے آپ کو نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ ایسے موقع پر ایک باپ پر کیا گزرتی ہے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، تاہم ظفر نے اس وقت صرف یہی کہا "الحمدللہ" تیموری اولادیں ایسے ہی سرخ رو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تک نہ تھا۔ ہڈسن نے کہا بھی کہ "کیا تمہاری آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ گئے ہیں۔" اس پر ظفر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ "ہڈسن شہنشاہ رویا نہیں کرتے۔"

مختصر یہ کہ انگریز اپنی چال میں پوری طرح کامیاب رہے، ظفر قید کر لیے گئے اور رنگون بھیج دیے گئے، جہاں انہوں نے نہایت بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اپنی زندگی گذاری اور آخرکار ہندوستان کا پہلا آزادی خواہ سراج الدین محمد ابوظفر ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔ قید وبند کی مشقت اور پریشانیوں کا ذکر انہوں نے اپنی ایک اردو غزل میں نہایت دردناک انداز میں کیا ہے ایک شعر ملاحظہ ہو

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے　　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مرتے وقت بھی ظفر کی زبان پر فقط یہی بات تھی کہ غم مرنے کا نہیں، مگر غم ہے تو صرف یہ کہ میں اپنے محبوب ملک میں دفن نہ ہو سکا۔ ظفر کے رنگون جانے کے بعد انگریزوں نے دلی ہی نہیں بلکہ ان تمام جگہوں پر قتل عام کیا جہاں کے لوگوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں پر بھی ظلم کیے۔ ان کے بچوں کو زندہ کنوؤں میں پھینک دیا گویا نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کا ظلم بھی ان کے سامنے پھیکا تھا۔ کانپور، لکھنؤ، جھانسی، الہ آباد، اور میرٹھ وغیرہ جگہوں میں اس قدر لوگ مارے گئے کہ مقتول وہاں انگریزی فوج کے مددگار کوئی ہندوستانی نظر نہ آیا۔ غرض ہندوستان کی جنگ آزادی کا پہلا متوالا یعنی بہادر شاہ ظفر کی ناکامی کا اگر حقیقت میں کوئی ذمہ دار ہے تو وہ آپسی پھوٹ، رقابت، حسد اور بغض تھی۔ ان تمام عیبوں سے اگر ہندوستانی عوام پاک رہتے تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

اگر آج بھی اپنے ملک کی حفاظت ہم کرنا چاہتے ہیں اور قومی یکجہتی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں آپسی پھوٹ، جلن اور حسد اور بے ایمانی سے بچنا ہوگا۔ اور بقول ظفر "آزادی ہماری سب سے بڑی برکت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔" پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ آج اگر ہم اسے پالیں تو ہماری قومی یکجہتی میں ایک کارآمد قدم ہوگا، اور یہ ظفر کے لیے سب سے عظیم خراج عقیدت بھی ہوگا۔

ڈاکٹر محمد اقبال
ریڈر شعبہ فارسی،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سفرنامۂ حکیم ناصر خسرو پر حالی کا دیباچہ

مولانا الطاف حسین حالی (پیدائش ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء، وفات ۱۹۱۴ء) انیسویں صدی کے ان دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں جن پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ اردو نثر و نظم پر ان کے احسانات کا تفصیلی جائزہ سب کا تجزیہ کیا جا چکا ہے۔ حالی نے جو خدمت اردو زبان و ادب کی انجام دی اگر وہ قابل ستائش ہے تو فارسی زبان و ادب کے سلسلہ میں ان کی خدمات بھی قابل توجہ ہیں۔ اس وقت فارسی ادب کے میدان میں حالی کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں۔ ہم صرف اس دیباچہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو حالی نے ناصر خسرو کے سفرنامہ پر لکھا تھا۔ یہ دیباچہ حالی کے فارسی ادب سے متعلق نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔ اس دیباچہ کے مطالعہ سے ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ حالی فارسی ادب سے متعلق بنیادی مصادر سے بخوبی واقف تھے۔ ان مصادر کے گہرے مطالعہ نے انہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ فارسی ادب کے اہم موضوعات پر تنقیدی نگاہ ڈال سکیں۔ وہ مختلف مصنفین کی کمزوریوں سے واقف تھے اس کا اندازہ ہمیں ان کے اس دیباچہ سے ہوتا ہے۔ ہم جب بھی فارسی ادب میں ہندوستان میں تنقید کی تاریخ لکھیں گے تو حالی کا نام فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ ہمارے صف اول کے ناقدین میں شمار ہوں گے۔

حالی نے حکیم ناصر خسرو کے سفرنامہ پر یہ دیباچہ فارسی میں لکھا ہے۔ اس میں ان تذکرہ نگاروں کے خلاف سیر حاصل بحث کی ہے، جنہوں نے ناصر خسرو کے حالات زندگی کو غلط انداز میں سفرنامہ کا مطالعہ کئے بغیر قلم بند کر دیا ہے۔ حالی نے سفرنامہ ناصر خسرو کا مطالعہ عمیق نظروں سے کر کے ان تذکرہ نگاروں کے بے بنیاد واقعات اور بیہودہ الزامات کی تردید کی ہے اور اس کی وضاحت میں مستند کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں۔ حالی کے مطابق حکیم ابو معین ناصر خسرو علوی خراسان کے مشہور شعراء میں سے تھا۔ وہ عربی کے علاوہ علم، حکمت اور فضل و دانش میں بھی یکتائے روزگار تھا۔ لیکن چند مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے بغیر تحقیق کے اس کی ذات سے ایسے واقعات وابستہ کر دیئے جن سے اس کا کوئی تعلق

نہیں تھا۔ ان تذکرہ نگاروں نے اگر ناصر خسرو کے سفرنامہ اور دیوان کا مطالعہ کیا ہوتا تو کبھی بھی یہ بے بنیاد اور لغو الزامات اس کی ذات سے وابستہ نہ کرتے۔

حالی کے خیال میں ناصر خسرو کی شخصیت کو مشتبہ بنانے میں ان شیعہ دشمن تذکرہ نگاروں کا ہاتھ ہے جو انہیں اسماعیلیہ فرقہ کا ایک اہم رکن سمجھتے تھے۔ حالی کا بیان ہے۔

''ناصر را از فرقۂ اسماعیلیہ گمان می کردند و اسماعیلیان را بہ لقب ملاحدہ و باطنیہ ملقب میداشتند۔''[1]

اسی غلط فہمی کی وجہ سے ناصر خسرو کے اشعار اس دور کے لوگوں نے پسند نہیں کیے اور تعصب اس درجہ تجاوز کر گیا کہ اس دور کے علماء و فقہاء نے ناصر خسرو کو باطنیہ فرقہ کا فرد قرار دے دیا۔ لہٰذا ناصر خسرو کے اشعار سے عوام میں انتشار پھیل گیا۔ جب یہ چرچا عام ہوا تو تذکرہ نگاروں نے بغیر کسی تحقیق کے عام لوگوں سے سنے سنائے واقعات کو قلمبند کر دیا۔ دوسری طرف ناصر خسرو کے معتقدین نے جب یہ حالت دیکھی تو انہوں نے ناصر خسرو کے متعلق فرضی کہانیاں و افسانے گھڑ ڈالے۔ حالی کے خیال میں اس آپسی کشمکش کے باعث ناصر خسرو کی اچھائیوں اور برائیوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا اور اس کی ادبی شخصیت پس پشت رہ گئی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کچھ نقادوں نے اپنا حق نبھانے کی کوشش کی ہے جن میں ایک نام چارلس شیفر کا ہے۔ اس فاضل محقق نے ناصر خسرو کے حالات کو فرانسیسی زبان میں تفصیل سے مرتب کیا ہے اس کے باوجود وہ بقول حالی اپنے بارے میں کہتا ہے

''ا بسبب اجنبیت زبان فرانسہ کلیتہً نمیتوان گفت کہ چقدر از عہدۂ تحقیق بیرون آمدہ و تا کجا داد نقد دادہ است۔''[2]

حالی کا تذکرہ نگاروں سے پہلا اختلاف یہ ہے کہ انہوں نے ناصر خسرو کا سال ولادت غلط لکھا ہے۔ حمد اللہ مستوفی قزوینی نے ''تاریخ گزیدہ'' میں ۳۸۵ھ/۹۹۵ء صاحب ''دبستان المذاہب'' نے ۳۵۹ھ/۹۶۹ء اور ''حبیب السیر'' کے مصنف نے ۳۵۸ھ/۹۶۸ء لکھا ہے۔ حالی کی تحقیق کے مطابق یہ تینوں سن ولادت ناقص ہیں۔ اس کے برعکس وہ ''مجمع الفصحا'' میں رضا قلی خان کے بیان کو بالکل درست مانتے ہیں کہ ناصر خسرو کا سن ولادت ۳۹۴ھ ہے اور اپنے بیان کی تائید میں ناصر خسرو کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

بگذشت ز ہجرت پس سی صد نود و چار   بنہاد مرا مادر بر مرکز اغبار[3]

حالی کا تذکرہ نگاروں سے ایک اور اختلاف یہ ہے کہ ان سب نے ناصر خسرو کا وطن اصفہان

جذبات برانگیختہ ہوگئے۔ انہوں نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا۔ ناصر خسرو نے بھی خود اپنے بعض اشعار میں اہل خراسان کی دشمنی کو اہل بیت سے دشمنی بتایا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے

گرچہ مرا اصل خراسانی است — از پس پیری و مہی و سری
دوستی عترت و خانہ رسول — کرد مرا یمگی و مازندری [19]

تذکرہ نگاروں نے حکیم ناصر خسرو کے مذہب و عقائد کے بارے میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ حالی رضا قلی خان کے بیان کو نقل کرتے ہیں

"او را بر مذہب حق گفتہ است کہ شیعی و نی منحصر در طریقہ اثنا عشریہ است۔"[20]

حالی کی نظر میں یہ بات ایک خام خیال سے زیادہ نہیں ہے۔ سفرنامہ میں حکیم نے جہاں کہیں شیعوں کا ذکر کیا ہے "چنان می نماید کہ از این طائفہ نسبت تبرا می دارد"[21]

حالی معروف تذکرہ نگار دولت شاہ سمرقندی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ناصر خسرو را بعضی عارف و موحد و بعضی دہری و طبیعی گفتہ اند"[22] بعض کی نظر میں وہ "بصحبت شیخ ابوالحسن خرقانی رسیدہ مدتہا بہ ریاضت و تصفیہ باطن مشغول بود"[23] حالی کے خیال میں یہ تمام باتیں مصدقہ اور قابل وثوق نہیں ہیں۔ حقیقت یہ کہ ناصر خسرو جس وقت مغرب کے سفر پر روانہ ہوا تھا وہ اہل سنت والجماعت کے اصولوں پر عمل پیرا تھا۔ سفرنامہ کی اکثر عبارتیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ جناب عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عمر فاروق کا نام گرامی سنیوں کی طرح احترام سے لیتا ہے اور حج کے مناسک بھی اہل سنت کے مطابق بیان کئے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں کہ بعضی اشعار او دیدہ ام کہ حضرت صدیق و فاروق و ذی النورین را بصدق و عدل و حیا ستودہ است۔[24]

حالی کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں ہے کہ ناصر خسرو کے تین سالہ اقامت مصر کے دوران اسماعیلیہ فرقہ کی معاشرت اور مصاحبت سے اس کی طبیعت اور خیالات میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ وہ ان کی روش کو برا نہیں سمجھتا تھا اور خلافت فاطمیین کو اپنے وقت میں خلافت عباسیہ کے برابر اور نزدیک تر سمجھتا تھا۔ اور علی مرتضیٰؓ کو خلفاء ثلاثہ پر برتری دیتا تھا۔ اور ائمہ اہل بیت کو سرچشمہ علم باطن و خزان اسرار شریعت گردانتا تھا۔ حالی کا بیان ہے کہ ان سب کے علاوہ وہ اسماعیلیہ کے بعض خاص عقائد کو بھی اپنے کلام میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً اسماعیلیہ نفس کلی کے قول کو مصدر کائنات سمجھتے ہیں لیکن اس عقیدہ میں پوشیدہ اسلام سے واحد فرق یہ ہے کہ اس کی اصل ان کے اسماعیلی عقائد ہیں جن کے بارے میں ناصر خسرو اس طرح

۴۴۱ھ لکھی ہے۔ یہ قول بھی سابق قول کی طرح درست نہیں ہے اس کے مطابق اس کی عمر زائد بر چہل و ہفت سال نہ شد ۳۱۔ حالی کہتے ہیں کہ ناصر خسرو نے ساٹھ سال کی عمر میں جو قصیدہ کہا ہے اس سے ہم دو شعر یہاں نقل کرتے ہیں۔

گرتیم از گلشن دور است من   از دل پر حکمت در گلشنم

شصت و دو سال است کہ گوید ہمی   روز و شبان گردون در یا نم ۳۲

حبیب السیر اور تاریخ گزیدہ کے مصنفین کے مطابق ناصر خسرو کی عمر ۱۰۰ سال سے تجاوز کر گئی تھی اور مجمع الفصحی کے مطابق "یک صد و چہل سال عمر یافت و در ۴۳۱ھ بعالم باقی شتافت"۔ ۳۳ حالی کی رائے میں یہ سب اقوال پایہ صحت سے عاری ہیں اور زیور تحقیق سے عاری ہیں۔ صحیح ترین قول حاجی خلیفہ نے تقویم التواریخ میں "عمر حکیم ہشتاد و ہفت سال" لکھا ہے۔

حالی ناصر خسرو کی سوانح، معتقدات اور تاریخی ماخذ پر اپنی ناقدانہ رائے پیش کرنے کے بعد سفر نامہ ناصر خسرو کی ادبی و فنی خوبیوں پر اپنی رائے دیتے ہیں

"سادگی الفاظ و راستی بیان کہ درین سفر نامہ دیدہ می شود گواہ این معانی است کہ صفت ہای بی مزہ و مبالغہ ہای دور از کار کہ بعد ہا در نشات ایران بکلی راہ یافت تا قرن خامس ہیچ وجودی نداشت۔ در تمام سفر نامہ یک واقعہ برخلاف عقل و عادت ذکر کردہ است۔" ۳۴

حالی کی نظر میں سفر نامہ میں واقعات و حادثات کو مورخانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اس قسم کی کتابیں دنیا میں کمیاب ہیں۔ اس کے بعد حالی، ناصر خسرو کے کلام کی فنی خوبیوں کو روشن کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکیم خسرو کے کلام میں ایک بھی شعر عشق و جوانی یا دنیا کی مدح سے متعلق نہیں کہا گیا ہے۔ اس کے کلام میں حکمت و فلسفہ موجود ہے۔ مجموعہ کلام مناقب رسول صلی اللہ علیہ وسلم محامد مستنصر باللہ مواعظ در حکم و اسرار تکوین و شکایات زمانہ اور ذم معاصرین سے پر ہے۔ لیکن اس نے بلاغت شاعرانہ کے ساتھ جزالت حکیمانہ کو یکجا کر دی ہے۔ نظم میں ادائے مطلب پر جو اس کو قدرت حاصل ہے وہ دوسروں کے یہاں کمیاب ہے۔

حالی کا یہ ناقدانہ تحقیقی تجزیہ فارسی ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مقدمہ معلومات سے مشتمل رہا ہے اور فارسی کے تحقیقی و تنقیدی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی

۱۔ الطاف حسین حالی۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۳ تحفۂ ہند پریس، دہلی۔ ۱۳۳۲ھ

۲۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۴

۳۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۵

۴۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۵

۵۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۵

۶۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۶

۷۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۸

۸۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۸

۹۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۹

۱۰۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۵۹

۱۱۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۲

۱۲۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۳

۱۳۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۳

۱۴۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۳

۱۵۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۴

۱۶۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۴

۱۷۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۴

۱۸۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۵

۱۹۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۵

۲۰۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۷

۲۱۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۷

۲۲۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۸

۲۳۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۸

۲۴۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۸

۲۵۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۹

۲۶۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۶۹

۲۷۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۱

۲۸۔ الموت ایک قلعہ کا نام ہے جو خراسان میں اسماعیلیہ مشرق کے ابتدائی تسلط کے زمانہ میں وجود میں آیا اور اسی سبب سے ایران کے اسماعیلیوں کو الموتیہ کہتے ہیں۔

۲۹۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۱

۳۰۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۲

۳۱۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۲

۳۲۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۲

۳۳۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۲

۳۴۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی۔ ص ۷۳

کہ وہ اپنے ادارے سے مرتب کرا کے شایع کریں۔ اب انہیں لکھ دوں گا کہ یہ کام ہو رہا ہے۔ دوسرا تذکرہ جو شایع ہونا چاہیے وہ خان آرزو کا 'مجمع النفایس' (۳) ہے۔ اس کے لیے بھی میں نے عارف صاحب سے کہا ہے۔ خود عارف صاحب 'انیس الاحبا' (۴) (موہن لال انیس) مرتب کر رہے ہیں۔

'ارمغان علمی' (۵) (برائے ڈاکٹر وحید قریشی) پر کام اب لاہور میں ہو رہا ہے۔ میں نے تمام مضامین ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے سپرد کر دیے ہیں۔ عارف نوشاہی بھی اس کام میں شریک ہو گئے ہیں اور یہ انہیں کے ادارے سے شایع ہوگا۔

رسالہ اردو میں شاد کا مرثیہ میں نے ہی شایع کیا تھا۔ اس سے متعلق ضروری چیزیں میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ مجھے یہ مرثیہ صفیر بلگرامی کے ذاتی کاغذات میں سے ملا تھا جو ان کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی کے پاس تھے۔

رام پور میں ڈاکٹر ابن فرید رہتے تھے۔ آپ اُن سے ضرور ملیے۔ بہت عالم آدمی ہیں۔ میرے خاص اخلاص کرم فرما ہیں۔ میرا سلام ان تک پہنچا دیجیے۔ میں خیریت سے ہوں اور حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف۔ آپ کی صحت و شادمانی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

---

(۱) عصر حاضر کے معروف مخطوطہ شناس اور محقق۔ درجنوں کتابوں، رسالوں اور فہرست مخطوطات کے مصنف، مولف و مرتب ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ دانشگاہ تہران میں ہم ایک ساتھ ہی پڑھ چکے ہیں۔ مولانا آزاد بلگرامی پر تحقیقی کام کرنے کا مشورہ مجھے نوشاہی صاحب نے ہی دیا تھا۔ یہ کتاب تہران سے شایع ہو چکی ہے اور اس کا انتساب اُن ہی کے نام ہے۔ نہایت عالم و فاضل، خلیق و منکسر مزاج و دوست داشتنی ہیں۔ ہر ایک سے علمی و تحقیقی کاموں میں بڑھ چڑھ کر مدد کرنے کا جیسا جذبہ نوشاہی صاحب میں پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ خدا انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے مواقع عنایت فرمائے۔ آمین۔

(۲) پروفیسر شریف حسین قاسمی سابق صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی نے اس تذکرے کی جلد اول مرتب کی جسے رام پور رضا لائبریری نے ۲۰۰۱ء میں شایع کر دیا ہے۔ اس کا بقیہ حصہ بھی امید ہے

جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔

(۳) اس تذکرے کی جلد اول بکوشش ڈاکٹر زیب النسا علی خاں (سلطان علی) مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد سے ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آچکی ہے۔ بقیہ جلدیں بھی زیر اشاعت ہیں۔

(۴) یہ تذکرہ پروفیسر انوار احمد سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ خدا بخش لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۲ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے بعد نوشاہی صاحب نے اس کام سے صرف نظر کر لیا۔ حالانکہ ان کی دسترس میں اس تذکرے کے سارے نسخے ہیں اور اگر وہ اس کی ترتیب و تدوین کی طرف توجہ کرتے تو یقیناً اس تذکرے کا ایک عمدہ اڈیشن، اہل علم کی دسترس میں آجاتا۔ پروفیسر انوار احمد صاحب نے بھی بہت محنت سے اسے مرتب کیا ہے۔

(۵) یہ ارمغان علمی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے لیے راقم سطور نے 'تذکرۃ الکاتبین' مولفہ راقم دہلوی پر مقالہ لکھا تھا جو اس ارمغان میں شامل ہے۔

بقیہ جیلا کے کتبے

اردو ترجمہ

''یہ مزار رضیہ بنت غلام حسین بن ہدایت علی خاں مرحوم کا ہے جس کا انتقال شب پنجشنبہ ۸، ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ کو بائیس سال تین ماہ کی عمر میں ہوا۔ (اس کی موت سے) دلوں پر جگر سوز داغ پڑے۔ (وہ) اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کی حامل تھی۔ انتقال کے وقت کی صورت حال عجب ہے جسے بیان کیا جا رہا ہے۔ موت سے بہت خائف تھی۔ اس مرض میں وفات سے پانچ چھ روز قبل جب اسے بخار تھا، چند لمحے کے لیے اس پر غنودگی طاری ہوئی (خواب میں) امیر المومنین (حضرت) علی علیہ السلام کو دیکھا۔ شمال و مغرب کے مابین اس کی آرام گاہ کے قریب گھوڑے پر سوار ہیں اور وہ بھی رکاب میں کھڑی ہے۔ حضرت کے سامنے چند لوگ لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ اسے اس جسارت کی تاب نہ رہی۔ انھیں ذرا سی دھمکاتی ہے اور حضرت اس کی دلجوئی فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں ان سے جنگ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کا حوصلہ بڑھا۔ وہ ان کی سرزنش کرتی ہے۔ جب وہ مغلوب ہو کر خاموش ہو گئے تو اس نے آپ کی خدمت میں

اپنے احوال بیان کیے۔ کہتی ہے کہ میں موت سے بہت ڈرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا: نہ ڈرو۔ موت اچھی چیز ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں بے شمار راحت ہے۔ اس نے عرض کیا کہ کیا کروں؟ یہ خوف مجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ حضرت فرماتے ہیں: تو ابھی نہیں مرے گی، کیوں ڈرتی ہے؟ جب تیری موت کا وقت آئے گا تو میں تجھے کسی نہ کسی طرح لے جاؤں گا کہ ہرگز پتا نہیں چلے گا۔ موت کے بعد اس دنیا میں اتنی لذتیں اور راحتیں ہیں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کہا کہ مجھے امید ہے اس دنیا میں نیکی دیکھوں گی۔ آپ نے فرمایا: موت سے پہلے اس کا ادراک ممکن نہیں۔ اس نے گریہ وزاری کے ساتھ عرض کیا: اس کا تھوڑا سا حصہ میں دیکھ لیتی۔ فرمایا: کیا مضایقہ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ پھر فرمایا: اپنی مالکہ حضرت فاطمہ زہرا (س) کی زیارت کی ہے۔ میرے ساتھ اُس آستانے پر چلو جہاں وفات سے چھ سال پہلے حضرت مقدسہ خاتون جنت (س) کی زیارت کی تھی اور وہاں آستانہ تعمیر کیا گیا۔ حضرت کے ساتھ زیارت کے لیے آئی۔ تھوڑی دور آپ کے ساتھ چلنے کے بعد بڑی بڑی عمارتوں اور جنت کے باغوں کے آثار عمارتوں کے باہر سے نمودار ہونے لگے اور ان مقامات کے باہر ایسی جگہیں نظر آئیں جو نہایت پر فضا اور مصفا تھیں۔ جہاں اس کی والدہ مقیم تھیں۔ وہ ان مقامات میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ قبل از وقت ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد بیدار ہوئی۔ مجھے بلوایا اور جو کچھ (خواب میں) دیکھا تھا، بیان کیا۔ مجھے اور دیگر سننے والوں کو اس کے شفایاب ہونے کا یقین ہو گیا۔ جب مقررہ شب کی شام آئی (یعنی موت کا وقت آن پہنچا) تو گزشتہ روز سے تھوڑا کم بخار محسوس کیا۔ اپنے آپ کو چاروں طرف سے درست کیا اور خوابِ غفلت میں چلی گئی اور اسی طرح سوئی۔ تین پہر رات گزرنے پر بغیر کسی شدت و اضطراب کے جس سے اس کی موت واقع ہونے کا اندازہ ہوتا، اس جہان ناپائدار سے دار القرار کی جانب رحلت کی اور سید الاوصیا علی مرتضی کے قول کی صداقت ظاہر ہوئی۔ خیر اللہ تعالی مع سید الانبیاء والمرسلین محمد و امیر المومنین علی عترتہما المعصومین وصلوات اللہ علیہم اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔"

سید حسن عباس

IDRAK

KITAB-E-SHASHUM

Compiled by:

• Dr. S.H. Abbas
• Prof. M.N. Siddiqui • Prof. H.S.A. Haidery
• Dr. Aftab Ashraf • Dr. Md. Salman

Rs. 150